توحید و شہادت

البلاغ والہلال کے نادر و نایاب مضامین

مولانا ابوالکلام آزاد
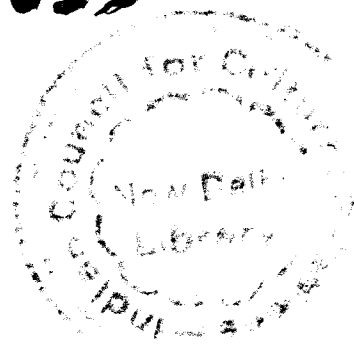
اعتقاد پبلشنگ ہاؤس
۱۵۶۱ گلی کوتانہ سوئیوالان دہلی ۲-۱۱۰۰۰۶

انسان کی حیاتِ صالحہ اور اسکی طبعی عمر

دنیا معدوم تھی، وجود میں آئی، پھر معدوم ہو جائے گی، نباتات، حیوانات، معدنیات، کا وجود صفحۂ ہستی پر نہ تھا، خدا نے ان کو پیدا کیا، اور وہی ایک دن ان کو الٹ دے گا۔ دنیا کے نشیب و فراز مٹ جائیں گے، اور خدا اور خدا کے فرشتے ایک ہموار میدان میں کھڑے ہو کر انسان کے اعمالِ فاسدہ و صالحہ کا جائزہ لیں گے۔

كلا اذا دكت الارض دكا دكا وجاء ربك والملك صفا صفا (فجر)

جب زمین چور چور کر دی جائے گی، اور تمہارا پروردگار اور اس کے فرشتوں کے پرے کے پرے آجائیں گے۔

اعمال صالحہ و اخلاق فاضلہ کے قائم رکھنے کے لئے ذوق فطری دیا گیا، پیمانہ عام قائم کیا گیا، خیر و شر کی حد بندی کر دی۔ لیکن کیا تمہارے اعمال اس قانون الٰہی سے آزاد ہیں؟ نہیں تمہارے اعمال، تمہارے اخلاق، تمہارے فضائل بھی دنیا کی اور

بار اوّل سنہ ۱۹۸۸ء
با اہتمام اطہر حسین صدّیقی
قیمت ۱۰/-
طابع زم زم پریس دہلی ۶

اور قلعہ فتح کر لیتا ہے۔ دیوار دوہم سے گر پڑتی ہے اور چار پشت کے بعد اعمال صالحہ کا گھرانہ عموماً دوسری جگہ منتقل ہو جاتا ہے۔

اگرچہ بہت سے خاندانوں کا شرف اس سے زیادہ مدت تک قائم رہتا ہے اور بہت سے خاندان اس سے پہلے بھی برباد ہو جاتے ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اعمالِ صالحہ کی متوسط عمر یہی ہے۔ قرآن حکیم اور حدیث و تاریخ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

لیس علی الذین اٰمنوا و عملوا الصالحات جناح فیما طعموا اذا ما اتقوا و اٰمنوا و عملوا الصالحات ثم اتقوا و اٰمنوا ثم اتقوا و احسنوا واللہ یحب المحسنین۔	جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کیا، ان پر کوئی گناہ اس چیز کے لئے نہیں ہے جس کو انھوں نے کھایا، جب کہ تقوے اختیار کیا ایمان لائے، اور عمل صالح کیا، پھر تقویٰ اختیار کیا اور ایمان لائے، پھر تقوے اختیار کیا اور احسان کیا، اور خدا احسان کرنے والے کو دوست رکھتا ہے۔
(مائدہ: ۹۴)	

ایمان و عمل صالح کے بعد ایک درجہ قائم ہو گیا۔ اس کے بعد خدا نے تین بار تقویٰ و ایمان و احسان کی ہدایت کی، اس لئے یہ چاروں درجے مکمل ہو گئے۔ چوتھے درجہ پر احسان کا حکم دیا کہ عمل صالح کی تکمیل احسان ہی ہے۔

خدا نے اگرچہ ان مراتب اربعہ کو چند متعین اشخاص کے ساتھ محدود کر دیا ہے، لیکن یہ قرآن حکیم کا عام انداز ہے کہ باپ کے اعمال کو اولاد کی طرف منسوب

چیزوں کی طرح معدوم تھے۔ قوتِ صالحہ نے ان کو پیدا کیا، مگر وقت و مکان کے لحاظ سے ان میں بھی ایک سلسلۂ وجود و عدم جاری ہے۔

جس طرح دنیا کی ایک عمر ہے، اشخاص کی ایک محدود زندگی ہے، اقوام کے موت و حیات کی ایک مدت ہے۔ یہی حال تمہارے فضائل و مناقب کا بھی ہے۔ حضرت آدم کا سلسلۂ نسب قیامت تک قائم رہے گا مگر بنی آدم کا حسب چار پشتوں سے زیادہ نہیں چل سکتا۔ ایک شخص جدوجہد کرکے فضائل کا اکتساب کرتا ہے، علوم سیکھتا ہے، حکومت کی بنیاد ڈالتا ہے۔ مذہب کا سنگ بنیاد رکھتا ہے، اس کا بچہ اس جدوجہد کا ذکر اس کی زبان سے سنتا ہے، اس کے اعمال کو دیکھتا ہے۔ باپ مرجاتا ہے، اور وہ انہی طریقوں پر عمل کرتا ہے جن پر باپ نے عمل کرکے یہ بنیاد رکھی تھی، لیکن دیوار میں ذرا سا شگاف ہوجاتا ہے، کیونکہ باپ حصولِ محاسن کا موجد تھا، یہ مقلّد ہے، اور مقلّد و مجتہد کا فرق ظاہر ہے۔ دو پشت اس طرح گزر جاتی ہے اور شرف خاندانی قائم رہتا ہے۔ تیسری پشت شروع ہوتی ہے، اور یہ سلسلۂ خاندان صرف آباؤاجداد کی سنی سنائی باتوں کی تقلید کرتا ہے، اسی لئے شگاف میں اور زیادہ وسعت پیدا ہوجاتی ہے۔ پھر چوتھی پشت شروع ہوتی ہے۔ اور مغرور انسان آباؤاجداد کے فضائل اور جدوجہد کا مرقع نذر میں دیکھتا ہے اور یقین کرلیتا ہے کہ اب یہ وراثت دائمی ہے۔ جدوجہد اور عمل حق کی کوئی ضرورت نہیں جب قلعہ مستحکم ہوگیا تو پھر فوج کی کیا حاجت ہے؟ پس وہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جاتا ہے، یہ حال دیکھ کر محرکات و وسائل عمل بھی اس کو چھوڑ دیتے ہیں اور کسی دوسرے خاندان کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں۔ وہ خاندان ان آلات و اسلحہ کو لے کر اٹھتا ہے

زمانہ قابل ذکر نہیں۔

عموماً اقوام کی عمر، اشخاص سے زیادہ ممتد ہوتی ہے۔ یہی حال اخلاق وفضائل کا بھی ہے۔ اشخاص اور اشخاص کے ساتھ ان کے محاسن زندگی بھی چلے جاتے ہیں۔ لیکن قوم باقی رہتی ہے، اور اس کے ساتھ اس کی اخلاقی روح بھی قائم رہتی ہے۔ پس اگر ہم اخلاقی زندگی کو ترقی دینا چاہتے ہیں تو ہم کو اپنے تمام اعمال صالحہ کو جمہوریت کے قالب میں ڈھال لینا چاہیئے۔ اسلام کے قالب میں فطرتاً یہ روح موجود تھی۔ اس لئے اس کے تمام قوائے طبعی ایک مرکز پر جمع ہو کر جسم کو حرکت دیتے تھے۔ لیکن امتدادِ زمانہ نے اس مرکز کو اپنی جگہ سے ہٹا دیا۔ اس لئے شخصیت نے جمہوریت کی جگہ لے لی اور خلافت نے حکومت کی صورت اختیار کی۔ جب تک بدن میں قوت تھی مرض کے نتائج علانیہ محسوس نہیں ہوئے۔ لیکن جب جسم کی قوت میں اضمحلال پیدا ہوا تو دفعتاً ظاہر ہو گئے۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ مرض نے رطوبت عزیزی کو خشک کر دیا ہے، اور حرارت اصلیہ کا چراغ بجھ گیا ہے۔ اس وقت خدا کا فرشتہ پکارا۔ ظہر الفساد فی البرّ والبحر بما کسبت ایدی الناس۔ رطوبت اگرچہ خشک ہو گئی ہے، حرارت اگرچہ بجھ گئی ہے، مگر جسم باقی ہے اور وہ پھر اسی معجون مرکب سے توانائی حاصل کر سکتا ہے۔

O

کردیتا ہے، اس کے بعد کے تینوں مراتب نیچے کی پشتوں سے ساتھ تعلق رکھتے ہیں
حدیث شریف میں آنحضرت نے حضرت یوسف علیہ السلام کے مناقب کا ذکر
ان الفاظ میں فرمایا ہے :
انما الکریم ابن الکریم ۰۰۰ شریف، شریف کا بیٹا، شریف کا
ابن الکریم ابن الکریم ۰۰ بیٹا، شریف کا بیٹا، یوسف بن
یوسف بن یعقوب۔ ۰۰۰ یعقوب ہے۔
یعنی آپ نے کرم کا انحصار چار پشتوں میں کیا، جس کا مقصد یہ ہے کہ حضرت
یوسف کے خاندان نے شرافت کی کامل مدت کو پورا کرلیا، اور یہی چار پشتوں کی
مدت اس کی آخری سرحد ہے۔
ایک بار نوشیروان نے نعمان سے کہا "کیا عرب میں کوئی قبیلہ سب سے ممتاز ہے"؟
اس نے کہا ہاں! نوشیروان نے وجہ فضیلت پوچھی۔ نعمان نے جواب دیا، جس خاندان
میں تین سردار متصل ہوتے چلے آئیں، پھر چوتھے کی باری آئے تو تمام قبیلے میں وہ خاندان
ممتاز خیال کیا جاتا ہے۔ نوشیروان نے اس خاندان کو طلب کیا تو آل حذیفہ
بن بدر الفزازی نے شرافت کی یہ آخری سند پیش کی۔ اگر سلاطین عام کے خاندانوں
پر نگاہ غائر ڈالی جائے تو وہ بھی اس کی تائید کریں گے، اور خلافت راشدہ کا دور تو
اس کی واضح مثال ہے :
خیر القرون قرنی ثم الذین ۰۰ بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے، پھر وہ لوگ جو
یلونہم ثم الذین یلونہم ۰ ۰ اس کے بعد آئیں گے، پھر وہ جو اس کے بعد
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چوتھے دور کا ذکر نہیں کیا کہ فتنہ و فساد کا

فن تعمیر کے سب سے پہلے گھر تھے، ستاروں کے ہیکل سے آباد تھے۔ دنیا اسی تاریکی میں گھری ہوئی تھی کہ کلدان میں "مسلم اول" کا ظہور ہوا، جس نے:

فلما جن علیه اللیل را
کوکبا قال هذا ربی فلما
افل قال لا احب الافلین
فلما راالقمر بازغا
قال هذا ربی فلما افل
قال: لئن لم یهدنی
ربی لاکونن من القوم
الضالین۔ فلما راالشمس
بازغة قال: هذا ربی
هذا اکبر، فلما افلت
قال یا قوم انی بری مما
تشرکون۔ انی وجهت
وجهی للذی فطر
السموات والارض حنیفا
وما انا من المشرکین

رات کو ستاروں کو دیکھا تو کہا یہ میرا خدا ہے لیکن
جب ستارے چھپ گئے تو اس نے کہا:
میں چھپ جانے والوں کو خدائی کے لئے نہیں
پسند کرتا۔ پھر چاند نظر آیا تو پکار اٹھا کہ
یہ میرا خدا ہے، پر جب وہ ڈوب گیا تو کہا
میرا سچا خدا میری ہدایت نہ کرتا تو یقیناً میں
گمراہ ہو چکا تھا! پھر دن کو جب سورج چمکتا
ہوا نکلا تو اس نے کہا ہاں یہ میرا خدا ہے کہ یہ
سب سے بڑا ہے، لیکن جب وہ بھی غروب
ہو گیا تو اس نے اپنی قوم کو مخاطب کیا: لوگو!
میں ان سب سے تبری کرتا ہوں جن کو تم خدا کا شریک
بناتے ہو، میں تمام جھوٹے معبودوں سے منہ پھیر کر
اس سچے خدا کی طرف رخ کرتا ہوں جس نے
آسمان و زمین کو پیدا کیا۔ میں اپنے خدا کا کسی کو
شریک نہیں بناتا۔

یہ پہلا دن تھا جب اسلام نے حقیقت انسانی کے چہرہ سے پردہ اٹھایا، اور اس نے بتایا کہ اے انسان! تو مخلوقات کا بندہ نہیں۔ تو مخلوقات کا آقا ہے۔

توحید فی الاسلام

ان القوۃ للہ جمیعا (۲: ۱۶۰)

اس سے پہلے کہ دنیا نورِ اسلام سے منوّر ہو، انسان کا کیا حال تھا؟ وہ دنیا کے ذرّہ ذرّہ کو خدا سمجھتا تھا، جنگل کا ہر پیڑ اور درخت اس کا خدا تھا، زمین کا ہر خوفناک کیڑا اس کا خدا تھا، پہاڑ کا ہر سیاہ پتھر اس کا خدا تھا، وہ سانپ کو پوجتا تھا کہ سانپ دیوتا تھا، وہ دریا کو پوجتا تھا کہ دریا دیوی تھی، وہ پہاڑ کو پوجتا تھا کہ وہ دیوتاؤں کا مسکن تھا، وہ آگ کو پوجتا تھا کہ وہ کہیں اگنی دیوی تھی اور کہیں خدا کا مظہر تھی، وہ عام ستاروں کو پوجتا تھا کہ وہ حکمرانِ عالم تھے، وہ چاند اور سورج کو پوجتا تھا کہ وہ نور اکبر تھے، وہ حیوانوں کو پوجتا تھا کہ ان میں انسانوں سے زیادہ قوت تھی، وہ انسانوں کو بھی پوجتا تھا کہ خدا کے اوتار تھے!

ہندوستان جو علومِ ریاضیہ کا سرچشمہ تھا، پتھروں اور مورتوں کا بندہ تھا۔ یونان جو علومِ عقلیہ کا مرکز تھا، طرح طرح کے دیوتاؤں کا مسکن تھا، مصر و بابل جو علمِ ہیئت و

وسخر لکم ما فی السموات وما فی الارض جمیعا (۴۵: ۱۲)

خدا نے تمہارے لیے زمین و آسمان کی تمام چیزیں مسخر کر دیں؟

تو دریا کو دیوی نہ کہہ کہ وہ تیری ضروریات کا ایک خزانہ ہے:

سخر لکم البحر لتجری الفلک فیہ بامرہ ولتبتغوا من فضلہ (۴۵: ۱۱)

تمہارے لیے دریا کو مسخر کر دیا تاکہ اس میں خدا کے حکم سے کشتیاں چلیں اور اپنے رزق کو تلاش کرو۔

وھو الذی سخر البحر لتاکلوا منہ لحما طریا وتستخرجوا منہ حلیۃ تلبسونہا وتری الفلک مواخر فیہ ولتبتغوا من فضلہ ولعلکم تشکرون (۱۶: ۱)

خدا ہی ذات قدوس ہے جس نے دریا کو مسخر کیا تاکہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اس سے اپنی زینت کی اشیاء نکالو، اس میں تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں پانی کو پھاڑتی ہوئی چلتی ہیں تاکہ اس سے خدا کی برکت تلاش کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔

تو حیوانات کو دیوتا نہ سمجھ کہ وہ تیرے ہی فائدہ کے لیے مخلوق ہوئے ہیں۔

وجعل لکم من الفلک والانعام ما ترکبون لتستووا علی ظہورہ ثم تذکروا نعمۃ ربکم اذا استویتم علیہ وتقولوا سبحان الذی سخر لنا ھذا وما کنا لہ مقرنین (۴۳: ۱۲)

کشتی اور جانور تمہارے لیے پیدا کیے تاکہ تم ان کی پیٹھ پر سیدھے سوار ہو، پھر اپنے خدا کے احسان کو یاد کرو، اور کہو کہ پاک ہے وہ ذات جس نے ہمارے لیے مخلوقات کو مسخر کر دیا! ہم اپنی قوت سے ان کو مسخر نہ کر سکتے!

تو ان کے لئے پیدا نہیں کیا گیا۔ وہ تیرے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ تو ان کا غلام نہیں بنایا گیا، وہ تیرے غلام بنائے گئے ہیں تو مخلوقات سے اشرف ہے، اور تیری ذات تمام ہستیوں سے ارفع ہے۔ تو صرف خالق مخلوقات کا بندہ ہے، اور تمام مخلوقات کا آقا ہے۔ پھر تو جن کا آقا ہے، حیف ہے کہ ان کو اپنا خدا بنائے اور ان کے آگے غلامی کا سر جھکائے؟

ولقد کرمنا بنی آدم وحملنٰھم فی البر والبحر ورزقنٰھم من الطیبٰت وفضلنٰھم علیٰ کثیر ممن خلقنا تفضیلا (۱۷: ۷۰)

ہم نے انسان کو عزت و بزرگی بخشی، اس کو خشکی و تری میں سواری دی، اچھی چیزیں روزی کیں، اور اپنی اکثر مخلوقات پر فضیلت کامل عطا کی۔

اے انسان تمام دنیا تیرے ہی لیے بنی ہے۔ تو اس کی پرستش نہ کر۔

الم تر ان اللہ سخر لکم ما فی الارض؟ (۲۲: ۶۵)

کیا تم نہیں دیکھتے کہ خدا نے جو کچھ زمین میں ہے تمھارے لئے مسخر کر دیا؟

ھو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعا: (۲: ۲۹)

خدا ہی ذات اقدس ہے جس نے تمھارے لئے تمام زمین کی چیزیں پیدا کیں!

بلکہ آسمان و زمین کی سب چیزیں تیرے ہی لئے ہیں۔ تو ان کے لئے نہیں ہے پس تو ان کو خدا نہ جان:

الم تروا ان اللہ سخر لکم ما فی السموات وما فی الارض؟ (۳۱: ۱۹)

کیا تم نہیں دیکھتے کہ آسمان و زمین کی تمام چیزیں تمھارے لئے خدا نے مسخر کر دیں؟

ذات کے سوا دنیا میں کوئی وجود نہیں جس سے ڈرا جائے۔ ایک مشرک اپنے کو دنیا کی ہر شے سے کمتر و حقیر سمجھتا ہے لیکن ایک مسلم وجود ذات" عزیز و متکبر" کے سوا خود کو سب سے بلند اور سب سے اعلیٰ سمجھتا ہے، کیونکہ ہر لحظہ اس کے کان میں یہ آواز رہتی ہے:

ان العزۃ للہ ولرسولہ	عزت صرف خدا کے لئے ہے، اس کے رسول کے لئے
وللمؤمنین	ہے، اور مسلمانوں کے لئے ہے۔

اے مشرک انسان! تو کیوں خدا کے سوا اوروں کی طرف ہاتھ پھیلاتا ہے؟ کیا تو ان میں بعض سے بہتر اور بعض کے برابر نہیں ہے؟ اے مشرک انسان! تو کیوں خدا کے سوا اوروں سے ڈرتا ہے؟ کیا وہ بھی تیری ہی طرح خدا کی مخلوق نہیں؟ اے مشرک انسان! تو کن سے حاجت براری کی درخواست کرتا ہے؟ کیا وہ خود خدا کے محتاج نہیں؟ بس ایک ہی ہے جس کی طرف ہاتھ پھیلانا ہے، ایک ہی ہے جس سے ڈرنا ہے، ایک ہی ہے جس کے آگے جھکنا ہے، ایک ہی ہے جس کے آگے گڑگڑانا ہے، ایک ہی ہے جس کو اپنے سے بالاتر سمجھنا ہے، اور ہاں ایک ہی ہے جس سے حاجت برآری کی درخواست ہے:

قال افرأیتم ما تدعون من	اگر خدا مجھے مصیبت پہنچانی چاہے تو کیا
دون اللہ ان ارادنی اللہ	تمہارے معبود جن کو تم پکارتے ہو، اس
بضر، ھل ھن کاشفات ضرہ؟	مصیبت کو دور کر سکتے ہیں؟ اگر خدا اپنی
او ارادنی برحمۃ ھل ھن	رحمت مجھ پر نازل کرنی چاہے تو کیا وہ روک
ممسکات رحمتہ؟ قل:	سکتے ہیں؟ ہاں کہہ دو کہ خدا ہی کا رشتہ

آگ دیوی نہیں وہ تو تیرے ہی لئے پیدا ہوئی ہے:

والذی جعل لکم من الشجر الاخضر نارا (۳۶: ۸۰)
خدا وہ ہے جس نے سبز لکڑی سے تمھارے لئے آگ پیدا کی!

پہاڑ دیوتاؤں کا مسکن کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ تو خود انسان کے تابع ہے اور خدا کا فرمانبردار ہے:

انا سخرنا الجبال معہ یسبحن بالعشی والاشراق (۳۸: ۱۷)
ہم نے داؤد نبی کے لئے پہاڑ کو مسخر کر دیا کہ صبح و شام خدا کی تسبیح کریں:

آفتاب و مہتاب اور دیگر ستارے بھی اے انسان تیرے خدا نہیں، تو خود ان کا خداوند و آقا ہے، اس لئے تو ان کو سجدہ نہ کر!

وسخر لکم الشمس والقمر دائبین وسخر لکم الیل والنھار (۱۴: ۲۷)
تمھارے لئے آفتاب و ماہتاب کو مسخر کر دیا جو حرکت کرتے ہیں، اور اسی طرح رات اور دن اور ان کے خواص و مؤثرات کو بھی تمھارا تابع فرمان بنایا

وسخر لکم الیل والنھار والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامرہ (۱۶: ۱۲)
رات، دن، سورج، چاند، سب کو تمھارے تابع کر دیا۔ کیونکہ تمام ستارے خدا کے حکم کے تابع ہیں۔

غور کرو، ایک "مشرک" اور ایک "مسلم" کی زندگی میں کتنا فرق ہے؟ مشرک پتھروں سے ڈرتا ہے کہ وہ خدا ہیں، ستاروں سے ڈرتا ہے کہ وہ خدا ہیں، کہنہ اور بوسیدہ قبروں کی اینٹوں سے ڈرتا ہے کہ وہ خدا ہیں، خود انسانوں سے ڈرتا ہے کہ وہ خدا ہیں، لیکن ایک مسلم کا عقیدہ یہ ہے کہ "فاطر السمٰوات والارض" کی ایک

بنا سکے ۔ جس کا قلب مطمئن خدا کے سوا کسی سے خوفزدہ نہیں؟ اور کیونکر ممکن ہے کہ خوف وہراس اس دل پر قبضہ کر سکے جو خدا کے سوا کسی کے قبضہ میں نہیں؟ اور ہاں کیونکر ممکن ہے کہ متکبّرین کی ہیبت وعظمت، جبابرۂ عالم کا قہر وغضب سپاہیوں کا تیغ وسناں، اور فرعونوں کا جاہ وجلال اس انسان کو مرعوب کر سکے۔ جس کی نظر میں یہ سب کچھ سب ایک دست شل اور ایک عضو معطل سے زیادہ نہیں؟

پھر جس کی یہ حقیقت ہے، کیونکر ممکن ہے کہ وہ شدائد وخطرات سے خوف کھا کر نصرت حق سے باز آجائے؟ اس کا دل راستی اور سچائی کی سختیوں کو دیکھ کر لرز جائے، اس کی زبان قول حق سے خاموش رہے؟ اس کا قدم جادۂ صداقت سے متزلزل ہو جائے؟ کیونکہ مسلم کی حقیقت یہ ہے کہ وہ خدا کے سوا دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ اپنے نفع وضرر کی باگ اس کے سوا کسی کے ہاتھ میں نہیں دیکھتا۔

پھر کیا یہ سچ نہیں کہ مسلم فطرتاً خوددار ہے کہ اکثر مخلوقات سے وہ برتر اور بعض کے برابر ہے؟ کیا یہ صحیح نہیں کہ مسلم فطرتاً آزاد اور حُر ہے کہ خالق کے سوا وہ کسی مخلوق نہیں ڈرتا، کیونکہ قوتوں کا منبع اور قدرتوں کا مرکز اس کی نظر میں ایک ہی ہے:

ان یمسسک اللہ بضر فلا کاشف لہ، وان یمسسک بخیر فھو علیٰ کل شئی قدیر وھو القاھر فوق عبادہ وھو الحکیم الخبیر	اگر وہ ضرر پہنچانا چاہے تو کوئی اس کو ہٹانے والا نہیں، اور اگر نیکی اور برکت دینا چاہے تو وہ ہر بات پر قادر ہے، وہ بندوں پر غالب ہے، وہ ہر نکتہ سے آگاہ ہے، اور ہر خبر سے واقف ہے۔ (انعام)

حسبی اللہ علیہ یتوکل — بس کرتا ہے، بھروسہ کرنے والے صرف اسی
المتوکلون — کی ذات پر بھروسہ کرتے ہیں۔

پس جو مسلم ہے وہ خوددار ہے، کیونکہ خدا کے بندوں میں اس کا کوئی ہمسر نہیں، پھر کس سے وہ اپنی ذات کو حقیر سمجھے اور اس کے سامنے جھکے؟ اس نے صرف ایک ہی کے لئے اپنی ذات کو حقیر سمجھا، اور وہ اسی کے سامنے جھکا۔

جو مسلم ہے وہ آزاد ہے، کیونکہ مخلوقات میں کون بڑا ہے جس سے وہ ڈرے؟ اس نے ایک کو بڑا سمجھا اور اسی سے وہ ڈرا۔

مسلم خدا کے سوا کسی سے کیوں نہیں ڈرتا؟ اس لئے کہ وہ دل سے اعتقاد رکھتا ہے کہ:

خدا کے سوا نفع و ضرر کسی کے ہاتھ میں نہیں۔

دنیا کی ہر قدرت و قوت کا مالک وہی ہے۔

اس کے سوا کسی میں قوت و قدرت نہیں۔

مخفی دعاؤں کے سننے والا تنہا وہی ہے۔

دنیا کی تمام قوتوں کی عنان حکومت صرف اسی کے دست قدرت میں ہے۔

عطائے عزت و حیات و نفع و ضرر اسی کا کام ہے۔

ہماری طرح دنیا کا ذرہ ذرہ صرف اسی کا محتاج ہے، پر وہ کسی کا محتاج نہیں۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ شدائد و خطرات کا مہیب دیو اس مسلم کو خوف زدہ

جیسے کہ کسی نے پیدا کیا ہے۔

پورا کر دیا۔ کیا وہ پھر اسی عہدِ ظلمت کی طرف رجعت قہقری کر سکتا ہے، یا انسان کی سیاہ کاریوں کا ایک تیرہ و تاریک ظلمت کدہ تھا؟

بظاہر یہ سوال کتنا ہی تعجب انگیز ہو، لیکن دونوں دور کے نتائج اس کا جواب اثبات میں دیتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ وحشت و تمدن دو متضاد چیزیں ہیں، لیکن دونوں کے نتائج میں عجیب و غریب اتحاد ہے۔ آگ اگر پانی کو خشک کر سکتی ہے تو وہ ایک جامد مادہ کو سیّال بھی بنا سکتی ہے۔ پس جب ایک ہی قوت متضاد نتائج پیدا کر سکتی تو دو متضاد قوتیں متحد نتائج کیوں نہیں پیدا کر سکتیں؟

لیکن اس وقت نظریات کی ہنگامہ آرائی کی ضرورت نہیں۔ یہاں گفتگو واقعات اور واقعات کے نتائج سے ہے، اور وہ یکسر عالم آشکارا ہیں۔ زمانۂ وحشت میں خواتین آزاد تھیں، آج ان کی آزادی اور بھی بڑھ گئی ہے۔ زمانۂ وحشت میں انسان ہر چیز کو مباح سمجھتا تھا، اب ایک اعلیٰ درجہ کا متمدن انسان بھی بلا قید دنیا کی چیز سے تمتع اٹھا سکتا ہے۔ زمانۂ وحشت میں انسان بات بات پر لڑ پڑتا تھا، آج ایک مہذب انسان بھی سیادت جنسی و وطنی کے جوش میں ذرا سی بات پر تلوار اٹھا سکتا ہے۔ زمانۂ وحشت میں انسان ایک بی بی پر قانع نہیں تھا، آج متمدن آبادیاں بھی زیادہ وسعت و کامیابی کے ساتھ اسی پر عمل کر رہی ہیں۔ زمانۂ وحشت میں عورتیں صرف ستر عورت کا چھپانا کافی سمجھتی تھیں، آج تمدن کے مکمل لباس (فل ڈریس) میں عہدِ قدیم کا یہ منظر نظر آ سکتا ہے۔

غزواتِ اسلامیہ اور تجارت

دنیا نے جس نقطے سے اپنا سفر شروع کیا تھا، ہر پھر کر پھر اسی نقطے پر پہنچ گئی ہے۔ دنیا کا سورج اپنی تکوین کے پہلے دن وحشت و بہیمیت کے سر پر چمکا، اور آج تہذیب و تمدن کے خطِ استوا سے گذر رہا ہے۔ لیکن اس کی حرارت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ اس کا آتشیں چہرہ جس طرح تکوینِ عالم کے پہلے دن غصّہ سے سرخ تھا، اسی طرح آج بھی تاب ناک نظر آ رہا ہے!

بظاہر یہ ایک نہایت تعجب انگیز بات ہے۔ جس دورِ ترقی اور عہدِ تمدن نے حقائق و علوم میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا۔ اسرارِ عالم کے چہرے سے نقاب الٹ دی، بحر و بر کے ڈانڈے ملا دیئے۔ فضائے بسیط کے سیاروں کو قوتِ جاذبہ کے ایک رشتہ میں منسلک کر کے خدا کے اس احسانِ عظیم کو کہ:

خلق لکم ما فی الارض — زمین میں جو کچھ ہے اس کو خدا نے تمہارے ہی

کا استعمال کیا تھا۔ جب حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اسلام لائے، تو ان کی ماں نے ناراض ہو کر قسم کھائی کہ اگر وہ اس مذہب سے باز نہ آئے تو وہ ان سے کبھی بولوں گی، نہ کھانا کھاؤں گی، نہ پانی پیوں گی۔ یہ محض دھمکی ہی نہ تھی بلکہ اس نے اس پر عمل بھی کیا، اور اسی حالت گرسنگی میں تین دن گزار دیئے۔ تیسرے دن جب غرط ضعف سے بیہوش ہو گئی، تو اس نازک حالت کو دیکھ کر اس کے دوسرے بیٹے نے پانی پلا دیا۔ ہوش میں آئی تو سعد کو بد دعائیں دیں[1]

ابتدائے اسلام میں بعض صحابہ نے بھی کفار کو تجارت کی روک ٹوک کی دھمکی دی تھی۔ چنانچہ غزوہ بدر سے پہلے ایک بار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ عمرہ کی غرض سے مکہ آئے اور قدیم دوستانہ تعلقات کی بنا پر امیہ بن خلف کے ہاں قیام کیا۔ چونکہ کفار آزادی کے ساتھ عمرہ لانے کا موقع نہیں دیتے تھے۔ اس لئے انہوں نے ایک دن موقع پا کر دوپہر کے سناٹے میں امیہ کے ساتھ طواف کرنا چاہا۔ اتفاق سے ابوجہل سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے کہا: "تم اس طرح بے دھڑک مکہ میں طواف کر رہے ہو، حالانکہ تم نے گمراہ مسلمانوں کو اپنے یہاں پناہ دی ہے اور انکی مدد کر رہے ہو۔ اگر تم ابو صفوان (امیہ) کے ساتھ نہ ہوتے تو یہاں سے بچ کر واپس نہ جا سکتے۔"

اس پر حضرت سعد بن معاذ کو بھی غصہ آگیا۔ انہوں نے بھی دھمکی دی: "اگر تم مجھے طواف سے روکو گے تو میں تمہاری راہ میں اس سے بھی سخت رکاوٹیں پیدا کروں گا۔ یعنی مدینہ کے راستے سے تمہارا جو کاروان تجارت شام کو جایا کرتا ہے

---

[1] صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۲۷ مناقب سعد بن ابی وقاص

زمانہ وحشت میں انسان اپنے بغض و عداوت کو غیر ضروری اور غیر متعلق چیزوں کی طرف متعدی کر دیتا تھا، وہ ایک شخص سے لڑتا تھا تو اس کے گھر میں آگ لگا دیتا تھا، اس کو متعدد مادی فوائد سے محروم کر دیتا تھا۔ اس نے جو تعلقات دوسرے لوگوں سے قائم کر رکھے تھے ان کو منقطع کرنا چاہتا تھا، اس کی تجارت اور دوسرے ذرائع معاش میں مختلف طریقوں سے رکاوٹ پیدا کرتا تھا، آج بیسویں صدی کا متمدن انسان بھی یہ سب کچھ کرتا ہے۔ وہ بھی اسٹرائک کرتا ہے۔ کبھی ہوائیکاٹ کا وعظ کہتا ہے، کبھی تاروں پر سنسر کو بٹھا دیتا ہے، کبھی فاشٹ نیٹ کے ذریعہ ٹرینوں کو اڑا دیتا ہے، کبھی تجارتی جہازوں کو روک دیتا ہے بلکہ بعض اوقات ان کو ڈبو بھی دیتا ہے۔ اور اس کو دشمن کے بے دست و پا کرنے کا نہایت مہذب اور کامیاب آلہ سمجھتا ہے!

اسلام سے پہلے عرب بھی ایک وحشی ملک تھا، وہ بھی بیسویں صدی کے اس بے پناہ آلے کو استعمال کرتا تھا۔ بلکہ سب سے زیادہ پہلے اس نے خود اسلام ہی کے مقابلے میں اس کا استعمال کیا۔ ابتدائے بعثت میں دو سال تک کفار قریش نے باہمی معاہدے کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے ہر قسم کے تعلقات منقطع کر دیئے تھے۔ اس معاہدہ کی رو سے نہ کوئی شخص بنو ہاشم کو اپنی لڑکی دے سکتا تھا، نہ ان کے ہاتھ کوئی چیز بیچ سکتا تھا۔ اور نہ ان کے ساتھ کسی قسم کا لین دین کر سکتا تھا۔ سفرجیٹ عورتوں کو اپنی اس ایجاد پر بڑا ناز ہوگا کہ وہ آب و دانہ کا فاقہ کر کے قید خانے کی مصیبتوں سے بچ جاتی تھیں۔ لیکن سب سے پہلے عرب کی ایک عورت نے اسلام کے مقابلے میں اس آلے

میں نہایت سخت اور حریص تھے۔ یہاں تک کہ بچوں اور عورتوں تک کو رہن رکھتے تھے[1] اور قرض کے تقاضے میں نہایت بے مروّتی کا اظہار کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کے والد نے جب انتقال کیا تو ان پر ایک یہودی کا قرض باقی رہ گیا تھا۔ اس نے تقاضا کیا تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے چند دنوں کی مہلت مانگی۔ اس نے انکار کر دیا۔ انھوں نے آنحضرت سے سفارش کرائی۔ آنحضرت اس کے پاس خود تشریف لے گئے اور اس معاملے کے متعلق بالمشافہ گفتگو کی۔ لیکن اس نے آپ کی بھی سفارش کو رد کر دیا[2]۔

معاملات کے متعلق کفار کا جو رد عمل تھا وہ اس سے بھی زیادہ سخت تھا۔ اور اس کا اثر مسلمانوں پر بلکہ اسلام پر بھی پڑتا تھا۔ عاص بن وائل پر خباب کا کچھ قرض تھا جب انھوں نے اس سے تقاضا کیا تو اس نے کہا: جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار نہ کرو گے، میں تمھارا قرض نہ دوں گا۔

یہ لوگ خود آنحضرت کے ساتھ بھی نہایت بیہودہ طریقے سے پیش آتے تھے۔ آپ پر ایک کافر کا قرض تھا۔ اس نے اس سختی کے ساتھ آپ پر تقاضا کیا کہ صحابہ اس کی بے ادبی پر ضبط نہ کر سکے، اور اس کو اس گستاخی کی سزا دینی چاہی۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر روک دیا کہ " جس کا حق ہے وہ اس قدر باتیں سنا سکتا ہے[4]"

اہل عرب نے خارجی ممالک سے جو تجارتی تعلقات قائم کر لیے تھے، وہ بھی

---

[1] بخاری جزء ۳ - ص - ۱۱۸ [2] بخاری جزء ۶ - ص - ۳۵

[3] بخاری جزء ۵ - ص - ۷۰ [4] بخاری جزء ۵ - ص - ۹۱

اس کو روک دوں گا۔[1]

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے یہ صرف دھمکی ہی دی تھی، مگر بعض مسلمانوں نے اس پر عمل بھی کیا۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد جو مسلمان مکہ سے بھاگ کر ساحل دریا پر مقیم ہو گئے تھے، وہ مجبوراً قریش کے کاروان تجارت کی لوٹ سے اپنی ضروریات پوری کرتے تھے۔ تاہم خود آنحضرت نے نہ تو کبھی ایسا کیا اور نہ اس پر پسندیدگی ظاہر کی۔ چنانچہ جب قریش نے ساحل بحر کے مسلمانوں کی شکایت کی تو (حسب تصریح بخاری) آپ نے انہیں اپنے پاس بلا لیا۔

اسلام دنیا میں خالی ہاتھ آیا تھا۔ نہ ان کے دامن میں لعل و جواہر کے ذخیرے تھے، نہ وہ اپنی جیب میں چاندی سونے کے سکے رکھتا تھا۔ نہ اس کے پاس اس قدر سرمایہ تھا کہ لوگوں سے لین دین بڑھاتا، تجارت کی منڈیاں قائم کرتا، یا کم از کم بازار میں ایک معمولی سی دکان لگا لیتا۔ اس کی جھولی میں صرف مخلصین مومنین کے چند دل تھے، جو اگرچہ لال و جواہر سے زیادہ گراں قیمت اور چاندی سونے کے سکوں سے زیادہ بیش بہا تھے۔ لیکن اس وقت عرب کے بازار ضلالت میں ان کا کوئی خریدار نہ تھا!

اس زمانے میں عرب کی تجارت کا تمام کاروبار کفار مکہ اور یہود مدینہ کے ہاتھ میں تھا، لیکن عرب میں جو بداخلاقیاں عموماً پھیل گئی تھیں، ان کا اثر سب سے زیادہ داد و ستد کے معاملات پر پڑتا تھا۔ اس بنا پر تجارت تمام اخلاقی خرابیوں کا مرکز بن گئی تھی۔ عرب میں سب سے زیادہ متمول اور کاروباری قوم یہود کی تھی۔ لیکن یہ لوگ معاملات

---

[1] بخاری جزو ۵۔ ص ۱۷

سے تجارتی فائدہ اٹھانا پسند نہیں کیا۔ لیکن خدائے اسلام کو یہ علیحدگی پسند نہ آئی اور صحابہ کے اس طرز عمل کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی:

لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکم — اگر تم ترک زمانۂ حج میں خدا کے فضل یعنی تجارت سے فائدہ اٹھاؤ تو یہ کوئی گناہ کی بات نہیں۔

مدینہ منورہ میں یہودیوں کا مشہور قبیلہ بنو قینقاع زرگری کا پیشہ کرتا تھا اس نے ایک بازار بھی قائم کر لیا تھا جو انہیں کے نام سے مشہور تھا۔ بعض وقت ان لوگوں نے سر بازار مسلمانوں کے ساتھ اشتعال انگیز شرارتیں بھی کیں۔ چنانچہ ایک مسلمان عورت کسی زیور کے لئے ایک سنار کی دکان پر آئی تو ایک یہودی نے پیچھے سے آکر اسے بے پردہ کر دیا[1]۔ لیکن ان لوگوں کے ساتھ بھی کسی قسم کا تعرض نہیں کیا گیا بلکہ خود فاطمہ رضی اللہ عنہا کا مکان بھی اسی بازار کے متصل تھا، اور اس تعلق سے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس بازار میں تشریف لاتے تھے[2]۔ غالباً اسی ہمسائیگی کی بنا پر حضرت علی علیہ السلام نے یہودیوں سے لین دین کے تعلقات پیدا کر لیے تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے اپنی دعوت ولیمہ کرنی چاہی اور اس غرض سے اذخر (ایک گھاس ہوتی ہے جو سناروں کے کام آتی ہے) کاٹنے کے لئے نکلے کہ سناروں کے ہاتھ بیچ کر اس کی قیمت سے دعوت کا سامان کریں۔ تو قبیلہ بنو قینقاع ہی کے ایک سنار کو اپنے ساتھ لے جانا چاہا تھا[3]۔

خود آنحضرت کے معاملات قرض کا تمام تر تعلق یہود اور کفار کے ساتھ تھا۔

---

[1] تاریخ ابن اثیر   [2] بخاری جزو ۳۔ ص ۶۶۔

[3] ابوداؤد جلد ۲۔ ص ۹۳۔

اسلام کے لئے نہایت مضر تھے۔ چنانچہ وحیہ کلبی جب آنحضرت کا خط ہرقل شاہ قسطنطنیہ کے پاس لے کر گئے تو اس وقت ابو سفیان تجارتی اغراض سے شام میں مقیم تھا۔ ہرقل نے اس کو طلب کیا اور آنحضرت کے متعلق متعدد سوالات کئے ان سوالات کی سنجیدگی نے اگرچہ ابو سفیان کو آنحضرت یا اسلام کے معائب و مثالب کے اظہار کا موقع نہیں دیا۔ تاہم جب آنحضرت کے وفائے عہد کے متعلق دریافت کیا گیا تو باوجودیکہ اس کو آنحضرت کی پابندی عہد کا علم تھا، لیکن ہرقل کو در پردہ یہ کہہ کر مشتبہ کر دینا چاہا کہ "اس وقت تو ہم لوگوں کے درمیان معاہدہ صلح ہو گیا ہے، خدا جانے وہ اس کو قائم رکھتے ہیں یا نہیں؟" چنانچہ ابو سفیان کو خود اعتراف ہے کہ اس نے بہ ہزار دقت یہ موقع فراہم کیا تھا۔

ما امکنی من کلمۃ ادخل فیھا شیئا غیر ھذہ[1]	ہرقل نے مجھے یہ موقع ہی نہیں دیا کہ اس کے سوالات کے جواب میں تدلیس اور فریب کاری کر سکوں

ان اسباب کی بنا پر اسلام تجارتی معاملات میں روک ٹوک کرنے کا جائز حق رکھتا تھا۔ لیکن اسلام کی وہ سالہ فاتحانہ تاریخ میں ایک موقع بھی ایسا نہیں پیش نہیں آیا جبکہ اسلام کی کوہ شکن قوت کسی کاروباری ترازو سے ٹکرائی ہو۔ بلکہ اس کے خلاف اسلام نے عرب کے اندر تجارت کا بازار اور زیادہ گرم کر دیا۔ زمانہ جاہلیت میں اہل عرب نے خانہ کعبہ کے متصل ذوالمجنہ، عکاظ، ذوالمجاز، وغیرہ متعدد بازار قائم کر لئے تھے جو زمانہ حج میں تجارت کی اچھی خاصی منڈی بن جاتے تھے۔ اسلام نے چونکہ جاہلیت کے اکثر شعائر مٹا دیئے تھے، اس لئے اول اول صحابہ نے ان بازاروں

---

[1] بخاری جزو ۱۔ ب ۳۔ ص ۔ ۱۱۷

تشریف لائے تو اذن طلب کرکے حاضر خدمت ہوا، اور عرض کیا کہ جس مشرک سے میں قرض لیا کرتا تھا، اس نے آج مجھ سے نہایت سختی کے ساتھ گفتگو کی۔ نہ آپ کے پاس کچھ ہے، نہ میرے پاس کہ اس کا قرض ادا کروں۔ وہ میری عزت و آبرو کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ آپ مجھے اجازت دیجیے کہ کسی مسلمان قبیلہ میں اس وقت تک بھاگ جاؤں جب تک خدا آپ کو قرض ادا کرنے کے قابل نہ بنا دے یہ کہہ کر میں آپ کی خدمت سے واپس آیا۔ تلوار، ڈھال، توشہ دان، اور پاپوش کو سرہانے رکھ کر سو گیا۔ اور صبح کاذب ہونے کے ساتھ ہی بھاگ نکلنے کا ارادہ کیا۔ اسی حالت میں ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا کہ تمہیں آنحضرت بلا رہے ہیں۔ میں گیا تو چار اونٹنیاں بیٹھی ہوئی نظر آئیں جن پر سامان لدا ہوا تھا۔ آنحضرت نے فرمایا: قرض کے ادا کرنے کا سامان تو ہو گیا۔ کیا تم نے اونٹنیاں نہیں دیکھیں؟ پھر آپ نے فرمایا: تم ان کو مع اس غلہ اور کپڑے کے جو ان پر لدا ہوا ہے لے جاؤ اور اس سے قرض ادا کرو۔ فدک کے بادشاہ نے ان کو میرے پاس بطور تحفہ کے بھیجا ہے۔ "میں قرض دے کر پلٹا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا:—

سب قرض ادا ہو گیا؟" میں نے کہا: ہاں اب کچھ باقی نہیں ہے۔"

خارجی ممالک سے اہل عرب نے جو تجارتی تعلقات قائم کر لئے تھے اسلام پر ان کا نہایت مفر اثر پڑتا تھا۔ چنانچہ عرب میں شام سے جو قافلہ غلہ لے کر آتا تھا وہ اسلام کے لئے نہایت خطرناک تھا۔ یہاں تک کہ آپ نے جب حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے عدم شرکت غزوۂ تبوک پر تمام اخلاقی تعلقات منقطع کر لیے، اور تمام صحابہ کو ان سے علیحدگی کا حکم دیا، تو ان کو شام کے ایک نبطی نے

چنانچہ آپ نے ایک یہودی کے یہاں اپنی زرہ رہن رکھ کر کچھ غلہ خریدا[1] تھا۔ حالانکہ ایک طویل سلسلہ جنگ کے زمانے میں آلاتِ جنگ کو بہر حال محفوظ رکھا جاتا ہے

آنحضرت کے تمام خانگی اور ذاتی معاملات کا انتظام حضرت بلال کے متعلق تھا۔ یہ انتظامات جس طرح انجام پاتے تھے، اس کا حال جس تفصیل سے خود حضرت بلال نے بیان کیا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ معاملات کے متعلق اسلام کس قدر بے تعصب اور فیاض تھا۔ حضرت بلال فرماتے ہیں: "آنحضرت کے پاس کوئی سرمایہ نہیں تھا۔ ابتدائے بعثت سے تا دمِ وصال میں ہی آپ کے مصارف کا انتظام کرتا تھا۔ چنانچہ آپ کی خدمت میں جب کوئی برہنہ تن مسلمان آتا تو میں آپ کے حکم سے پہلے جا کر قرض لیتا، پھر اس سے کپڑا خرید کر اسے پہناتا، اور کھانا خرید کر کھلاتا۔ اس معمول کو دیکھ کر ایک دن ایک مشرک نے مجھ سے راہ میں کہا کہ میں دولت مند آدمی ہوں، مجھ سے قرض لیا کرو، اور کسی سے نہ لو۔ چنانچہ میں نے اسی سے معاملہ کر لیا۔ ایک دن وضو کر کے اذان دینے کے لئے اٹھا تو میں نے دیکھا کہ تاجروں کی ایک جماعت کے ساتھ وہ آ رہا ہے۔ جب اس نے مجھے دیکھا تو منہ بنا کر نہایت سخت الفاظ میں کہا "اے حبشی! تجھے معلوم ہے کہ مہینہ کب ختم ہوگا؟" میں نے جواب دیا "اب ختم ہوا ہی چاہتا ہے"۔ اس نے کہا "اب صرف چار دن رہ گئے ہیں۔ تم پہ جو قرض ہے، اب وصول کر لوں گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ جس طرح تم پہلے بکریاں چراتے پھرتے تھے اسی طرح مفلس ہو کر سرگشتہ پھروگے"۔ مجھے یہ سن کر نہایت رنج ہوا۔ عشاء کے بعد جب حضور اقدس گھر میں

---

[1] بخاری جزء ۲ ص ۵۶

وہ میدہ کی روٹی کھاتے تھے۔ لیکن اس کے لیے نہایت شوق کے ساتھ شام کے قافلہ کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ جب وہ قافلہ آتا تھا تو وہ لوگ صرف اپنے لیے میدہ خرید لیتے تھے۔ باقی تمام گھر کا خرچ اسی جو اور کھجور سے چلتا تھا۔[1] زمانۂ اسلام میں بھی یہی حالت قائم رہی۔

O

[1] ترمذی۔ ص ۔ ۳۹۶

جو مدینہ میں غلّہ لے کر آیا کرتا تھا، بادشاہ غسان کا ایک خط دیا، جس کا مضمون یہ تھا:

قد بلغنی ان صاحبک قد جفاک ولم یجعلک اللہ بدار ہوان ولا مضیعۃ فالحق بنا نواسک۔ (۱)	مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے آقا نے تم پر ظلم کیا ہے، لیکن خدا تم کو ذلیل و بے یار نہیں کرے گا۔ تم ہم سے مل جاؤ، ہم تمہارے ساتھ ہمدردی کریں گے۔

اگر حضرت کعب بن مالک کے جوش اخلاص نے اس خط کو تنور میں نہ ڈال دیا ہوتا، تو اس کا نتیجہ صرف یہی نہ ہوتا کہ ایک فرد اسلام کے دائرہ سے نکل جاتا بلکہ غزوات اسلامیہ پر بھی اس کا نہایت مضر اثر پڑتا۔ بایں ہمہ اسلام کی وجہ سے ان تاجروں کی گرم بازاری میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بلکہ ایک بار آپ نماز جمعہ پڑھا رہے تھے، اسی حالت میں شام سے ایک قافلہ آ گیا۔ تمام مسلمان نماز چھوڑ کر اس کی طرف دوڑے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف ۱۲ آدمی رہ گئے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

واذا رأوا تجارۃ او لھوا انفضوا الیھا و ترکوک قائما (۲)	جب وہ تجارت یا لہو کو دیکھتے ہیں، تو اس کی طرف دوڑتے ہیں اور تجھ کو کھڑے کا کھڑا چھوڑ دیتے ہیں۔

مفسرین کرام نے "لہو" کی تفسیر میں لکھا ہے کہ وہ لوگ اعلان عام کے لئے گھنٹہ بجاتے تھے۔ اس سے ان کی آزادی تجارت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ افلاس کدۂ عرب کی عام غذا تو کھجور اور جو کی روٹی تھی، لیکن جو لوگ دولت مند ہوتے تھے

---

(۱) بخاری جزو ۶۔ غزوۂ تبوک (۲) بخاری جزو ۴۔ ص۔ ۵۵

قرن کے مفہوم کے تعین میں محدثین نے غور وخوض کیا ہے۔ لیکن چونکہ دوسری حدیث "الخلافۃ بعدی ثلاثون سنۃ" (خلافت میرے بعد صرف تیس برس تک ہے) موجود ہے، اس لیے یقیناً اس حدیث میں قرن سے مراد دس برس کا زمانہ ہے۔ اور مقصود یہ ہے کہ بہترین دہ سالہ دور آنحضرت (صلعم) کا تھا، اس کے بعد دوسرا عشرہ اور اس کے بعد تیسرا جس کے بقیہ چھ مہینے حضرت حسن بن علی علیہما السلام کی خلافت سے پورے ہوگئے اور پھر زمانہ شر وفتن کا شروع ہوگیا۔

پس گذارش ہے کہ جس زمانے کی نسبت میں نے محدثات و بدعات کی ابتدا لکھی ہے، اس سے خیر القرون کی شہادت کو کیا تعلق؟ آپ مجھے اس طرح کے خلط بیان سے کیوں تعجب و تحیر میں مبتلا کرتے ہیں؟ کہاں خیر القرون کا زمانہ خیریت و افضلیت، اور کہاں دورِ امویہ و مروانیہ کے قرون جبر و تسلط و مکاسب و عضوض؟ خیر القرون کا عہد میمون تو بنی امیہ کی حکومت سے پیشتر ہی ختم ہوگیا تھا اور فی الحقیقت وہی دورِ اسلام کی تعلیم کا اصلی نمونہ، اور اس کی عمر کا حاصل و مآلِ زندگی تھا۔

میں یقیناً اس زمانے کو امر بالمعروف ونہی المنکر کے سدباب کا پہلا دن اور محدثات و بدعات کی گرم بازاری کا آغاز عہد قرار دیتا ہوں، جس کی نسبت اسی حدیث کے بقیہ ٹکڑے میں سرورِ کائنات نے پیش آنے والے امور کی خبر دی تھی اور جس کو جناب نے غالباً کمیاں ایجاز و اختصار چھوڑ دیا۔ مگر میں (کہ باوجود ارادۂ سعی اختصار مبتلائے اطناب ہوچکا ہوں) اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ چنانچہ جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، فرمایا کہ بہترین زمانہ میرا اور اس کے بعد کا ہے۔ مگر

دولت بنی اُمیّہ

①

حدیث "خیر القرون"

آپ نے چونکہ قرونِ اُولیٰ کا لفظ لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً وہی مشہور مراد ہے، جس کو امام مسلم اور ترمذی نے عمران بن حصین سے باختلاف بعض الفاظ روایت کیا ہے کہ:

خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم. ترمذی کی الله میں "خیر الناس قرنی" اور خیر القرون الذی بعثت فیھم بھی ہے اور بعض میں "خیر القرون قرنی۔

حاصل سب کا یہ ہے کہ آنحضرت نے فرمایا "بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے، پھر اس کے بعد کا، اور پھر اس کے بعد کا"

فصدق اللہ العلی العظیم، وصدق رسولہ النبی الکریم، ونحن علی ذالک من الشاہدین۔

اخبار ظہور فتن و منکرات:

اصل یہ ہے کہ اخبار ظہور فتن و تحدید ازمنۂ خیر و فضیلت کی نسبت اگر شرح وبسط کے ساتھ لکھا جائے، تو اتنا وافر ذخیرہ ہے، اور اس کے متعلق بعض ایسے اہم مباحث ہیں کہ ایک پورا رسالہ چاہیئے۔ اس کی مہلت کہاں اور پھر ضرورت بھی نہیں۔ آپ نے ذکر کردیا، تو کیا کروں؟ باوجود ارادۂ اختصار و اجمال، خود بخود بحث بڑھتی جاتی ہے۔

اس بارے میں جو احادیث صحاح اور دیگر اسفار حدیث میں مروی ہیں اور آثار صحابہ و تابعین میں اس کی جو تصریح و تصدیق کی گئی ہے، ان سب پر نظر ڈال کر علماء سلف نے اس مسئلہ کو تقریباً حل کردیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ سب سے زیادہ صحیح اور صاف پیشین گوئی اس بارے میں "خیر القرون" والی حدیث ہے۔ جس کو اس مبحث کا اساس و بنیاد قرار دیتے ہیں۔ اس میں آنحضرت نے اپنے عہد رسالت، اس کے بعد دو زمانوں کو یکے بعد دیگرے بہترین قرار دیا، اور یہی زمانہ "خلافت علی منہاج النبوۃ" اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا عہد طلائی تھا۔ یہ زمانہ امیر معاویہ کی خلافت سے پہلے ختم ہوگیا، اور اس کی تصدیق ان احادیث سے ہوتی ہے، جن میں بتصریح اس کی اطلاع دی گئی ہے۔

چنانچہ "خیر القرون" والی حدیث کے مطالعہ کے بعد اس حدیث کو دیکھیئے جس میں صاحب مشکوٰۃ نے باب "الانذار والتحذیر" کی تیسری فصل میں درج کیا

اس کے بعد:

ثم یاتی من بعدھم قوم | ایک قوم آئے گی جو محض کثرت مال و جاہ و
یسمنون یحبون السمن | اکل و شرب، اور عیش نفس، اور ادعا و نمائش
(ترمذی جلد ۲ باب ۱ الفتن) | میں مبتلا ہو جائے گی۔

اس حدیث کا راوی اول عمران بن حصین ہے، اور آگے چل کر مختلف رواۃ نے مختلف الفاظ میں روایت کی ہے۔ چنانچہ ایک دوسری روایت میں بعض الفاظ زائد ہیں۔

مثلاً: "یشھدون ولا یستشھدون ویخونون ولا یؤتمنون، ویفشو فیھم السمن --" ترمذی نے اپنی اصطلاح میں اس کو "حسن صحیح" لکھا ہے۔

اور مسلم کی روایت میں ان الفاظ کے بعد "وینذرون ولا یوفون، و یظھر فیھم السمن" بھی ہے، اور اس سے علاوہ نفس پرستی، عیش پسندی اور دولت جاہ و نمائش کے تعبد و انہماک کے، عدل و امانت اور ایفاء عہد و اخلاق حسنہ کا بھی اس جماعت میں نہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔

پس یہی جماعت ہے، جو خیر القرون کے سی سالہ عہد کے بعد نمودار ہوئی، اور یہی دور بنو امیہ ہے جو "امر بالمعروف کے سد باب کا پہلا دن" تھا۔ اور یہی وہ دور محدثات و بدعات، فتن و قلاقل، اور شر و فساد امور ہے جس کی حضرت صادق و مصدوق (روحی فداہ) نے اسی حدیث میں، جو جناب کے استشہاد و استدلال کا عروۃ الوثقیٰ ہے: جس کی اطلاع کلام الٰہی نے بھی " و اتقوا فتنۃ لا تصیبن الذین ظلموا منکم خاصۃ " فرما کر دے دی ہے۔

عن سعید بن جمهان قال ثنی سفینة قال: قال رسول الله (صلعم) الخلافة فی امتی ثلاثون سنة ثم ملك بعد ذالك ثم قال لی سفینة: امسك خلافة ابی بکر، ثم قال: و خلافة عمر، وخلافة عثمان، ثم قال: امسك خلافة علی، فوجدناها ثلاثین سنة قال سعید فقلت له ان بنی امیة یزعمون ان الخلافة فیهم قال: کذبوا بنوالزرقاء بل هم الملوك من شر الملوك

سعید سے روایت ہے کہ سفینہ نے آنحضرت کے اس قول کی روایت کیا ہے کہ "خلافت میری امت میں صرف تیس سال رہے گی۔ پھر اس کے بعد محض حکومت اور بادشاہت ہے۔" اس کے بعد سعید کہتے ہیں کہ مجھے سفینہ نے کہا کہ حضرت ابوبکر کا زمانۂ خلافت شمار کرو۔ میں نے کیا۔ پھر کہا کہ حضرت عمرو عثمان وعلی کا عہد خلافت شمار کرو، میں نے سب کو جمع کیا تو کل تیس سال ہوئے۔ پھر میں نے کہا یہ تو سچ ہے لیکن بنی امیہ جو کہتے ہیں کہ ہم بھی خلیفہ ہیں یہ کیسی بات ہے، حالانکہ بموجب اس حدیث اور تمہاری بیان کردہ تطبیق کے خلافت قبل از بنی امیہ ختم ہوگئی۔ اس پر سفینہ نے کہا کہ زرقا کی اولاد نے (بنی امیہ نے) کذب بیانی اختیار کی۔ وہ خلیفہ کہاں ہیں؟ وہ تو شریر ترین بادشاہوں میں سے بادشاہ ہیں۔" (تامل)

ان تمام احادیث کی تطبیق سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ بہترین قرن آنحضرت کا تھا۔ اس کے بعد شیخین کی خلافت کا۔ اس کے بعد حضرت عثمان سے لے کر عام الجماعت تک کا، جبکہ حضرت امام حسن علیہ السلام نے خلافت سے کنارہ کشی فرمائی۔

عن بن بشير عن حذيفة،
قال: قال (صلعم) تكون النبوة
فيكم ما شاء الله ثم تكون
خلافة على منهاج النبوة،
ما شاء الله ان تكون ثم يرفعها
الله ثم تكون ملكا جبرية
فيكون ما شاء الله
ان يكون، ثم تكون
خلافة على منهاج النبوة
قال حبيب: فلما قام
عمر ابن عبد العزيز
كتبت اليه بهذا ا
الحديث اذكره اياه، و
قلت: ارجو ان تكون
امير المومنين بعد الملك
العاض والجبرية۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: جب
تک اللہ کو منظور ہے، تم میں وجودِ نبوت باقی
رہے گا۔ اس کے بعد منہاجِ نبوت پر خلافت قائم
ہوگی۔ اور جب تک اللہ چاہے گا قائم رہے گی
اور پھر اٹھالی جائے گی۔ اس کے بعد جور و ظلم کی
بادشاہت شروع ہو جائے گی۔ اور جب تک
منظورِ الٰہی ہے رہے گی۔ اس کے بعد محض جبر و
تسلط کی حکومت ہوگی، اور وہ بھی مشیتِ الٰہی کے
مطابق رہے گی۔ لیکن اس کے بعد پھر ایک
دور خلافتِ نبوت کے دور کا آئے گا۔
حبیب کہتے ہیں کہ جب عمر ابن عبد العزیز
تختِ خلافت پر بیٹھے تو میں نے یہ حدیث ان کو
لکھ کر بھیجی، اور لکھا کہ مجھے امید ہے کہ آپ اس
حدیث کی خبر کے مطابق "ملکِ عضوض و جبر"
کے بعد محض بادشاہ ہی نہیں بلکہ امیر المومنین
ہوں گے!

اس میں زمانے کی قید نہیں ہے، مگر ترمذی کی حدیث میں جس کو امام موصوف
نے دوسری جلد کے باب الفتن میں درج کیا ہے، زیادہ تصریح ہے۔

من الماشي والماشي خير من الساعي (متفق علیہ)

براہ کرم اس بارے میں کنز العمال کے ابواب فتن، یا کتب دلائل و خصائص مثل خصائص سیوطی وغیرہ کے ابواب اخبار پر ایک نظر ڈال لیجئے، اور خدارا اس پر تعجب نہ کیجئے کہ بدعات و محدثات کی گرم بازاری دور بنی اُمیّہ میں کیونکر تسلیم کی جا سکتی ہے؟

اگر طبرانی و حاکم اور بیہقی اور ابونعیم اصفہانی وغیرہ کی روایات پر بھی نظر ڈال لی جائے، تو دور بنی اُمیّہ، حتیٰ کہ بعد از شہادت حضرت فاروق فتنہ و فساد و منکرات و بدعات کے متعلق ایک ذخیرۂ وافر و مواد و محادثات کثیر موجود ہے۔[۵]

---

[۵] احمد، بیہقی، اور طبرانی نے عروہ بن قیس سے روایت کی ہے: قال الخالد بن ولید ان الفتن تو لظہورت، قال لھا ابن الخطاب حی، فلا انما تکون بعدہ۔

حافظ سیوطی نے خصائص کبریٰ اور جمع الجوامع میں ایک خاص باب اس عنوان سے باندھا ہے کہ "اخبارہ (صلعم) بالفتنۃ وان مبداھا قتل عمر" یعنی آنحضرت کی خبر دہی فتنہ کی نسبت، اور یہ کہ اس کا مبداء حضرت عمر کا شہید ہونا ہے۔ اس باب کی بنیاد تو بخاری و مسلم کی حذیفہ والی حدیث ہے جو مشہور ہے، لیکن اس کے علاوہ دیگر سنن و مسانید و معاجم کی حدیثیں بھی بکثرت جمع کی ہیں، جن سے گویا استدلال کیا ہے کہ حضرت عمر کی وفات کے بعد ہی فتنہ شروع ہوگا، اور ان کا وجود ایک دیوار درمیان امن و فتن کے ہے۔ غور کیجئے تو شہادت حضرت عثمان اور پھر جنگ صفین وغیرہ کے وہ مقاتلات، جن کا دس کم سولڑائیوں میں بروایت مشہور ستر ہزار صحابہ و مسلمین قتل ہوئے۔ اور ان میں ۸۰ سے زائد صحابہ و باقی بر صفحہ آئندہ)

اور پھر اس کے بعد محض "ملک عضوض" اور "ملک جبریہ" کا عہد فتن و فساد شروع
ہو گیا اور وہی دور بنی اُمیّہ اور "امر بالمعروف کے سد باب کا پہلا دن" تھا۔

یہ امر یہاں ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ ان احادیث اور نیز ان کے ہم مطلب
احادیث کی نسبت اس عاجز نے اپنے خاص پیش نظر مباحث سے اس موقع پر کچھ
کام نہیں لیا ہے۔ چونکہ جناب نے "خیر القرون" کی حدیث کی طرف اشارہ کیا، اور
ان احادیث سے جا بجا استشہاد فرمایا، اس لئے ضرور ہوا کہ جناب کو احادیث ہی
کی طرف توجہ دلائی جائے۔

پھر یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ان احادیث پر جناب نے نظر نہیں ڈالی، اور اس عاجز
کے اتنا لکھ دینے پر کہ "بنی اُمیّہ کے عہد میں بدعات و محدثات کا بازار گرم ہوا" اس
قدر متالم و متاذی ہوئے ہیں کیا جس عہد کی نسبت یہ تصریحات موجود ہیں، اس کی
اس کی نسبت ضمناً کسی موقعہ پر اشارہ کر دینے کا بھی آج کسی قلم کو حق نہیں؟ اور کیا
ان احادیث سے بالکل غض بصر کر لینے کی علت دریافت کرنے کی اس عاجز کو اجازت ملیگی۔

یہ تو وہ مشہور ترین احادیث تھیں، جن کو مشکوٰۃ وغیرہ میں ہر شخص دیکھ سکتا ہے
لیکن کیا وہ حدیث بھی جناب کو یاد ہے، جس کو ترمذی ابواب الفتن کے "باب
ما جاء فی الشام" میں لائے ہیں؟ اور جس کو ابن قرہ نے بایں الفاظ روایت
کیا ہے کہ "اذا فسد اھل الشام فلا خیر فیکم"؟ اور نیز یہ ان احادیث کے
علاوہ، تابعین، و تبع تابعین، و محدثین نے قرار دیئے ہیں، جن میں ظہور فتن و فساد
کا بکثرت خبر دی گئی ہے، اور جنہوں نے اسفار حدیث کے ابواب فتن سے بھرے
ہوئے ہیں؟ مثلاً ستکون فتن۔ القاعد فیھا خیر من القائم، والقائم فیھا خیر

کی تمیز اٹھ جائے گی۔ "الحب فی اللہ والبغض فی اللہ" تمام اعمال و افعال میں مسلمانوں کا محور اعمال ہے اور اچھے اعمال کو سمجھنا، اور برائی کو خواہ وہ کسی عہد میں ہوئی ہو، برا یقین کرنا، ایک ایسی شے ہے، جس کا خود ہمارے اعمال و خصائل پر اثر پڑتا ہے۔ اشخاص کی بحث خود بخود پیدا ہو جاتی ہے جبکہ اعمال پر نظر ڈالی جاتی ہے۔
یزید کے مظالم پر بعد کو آنے والے کیوں زیادتی ہیں، حالانکہ آپ کے اصول کے مطابق تو: "لا یاتی علیکم زمان الا الذی بعدہ شر منہ"

اطلاق لفظ فسق و ظلم نسبت بنی اُمیہ:

۹۔ بہت زیادہ تاسف جناب کو اس مضمون کی "خون سے شرابور سرخی" پر ہے اور اس پر کہ بنی اُمیہ کی طرف ظلم و فسق کو کیوں نسبت دی گئی؟ خیر اور تمام باتوں کو جانے دیجیے۔ آپ ترمذی کی اس حدیث کی نسبت کیا کہتے ہیں۔ جو اوپر گزر چکی ہے اور جس میں سفینہ کا بنی اُمیہ کی نسبت یہ قول نقل کیا ہے کہ "بل هم ملوك من شر الملوك؟"

قاتلین عمار بن یاسر:

پھر ان احادیث مشہورہ (اور بقول سیوطی متواترہ) کی نسبت کیا ارشاد ہوتا ہے، جن میں حضرت عمار بن یاسر کی شہادت کی خبر دی گئی کے ہاتھوں شہید ہوئے، اور جن میں ان کے قاتلوں کی نسبت "فئة الباغية" کا وصف فرمایا گیا تھا۔

عن ام سلمة و ابی قتادة	ام سلمہ اور ابو قتادہ سے روایت ہے کہ
ان رسول اللہ (صلعم)	آنحضرت (صلعم) نے فرمایا: اے عمار! میں

آگے چل کر کس قدر پر غیظ لہجے میں ارشاد ہوتا ہے :

"بنی امیہ لاکھ بُرے سہی پھر بھی اپنے بعد والوں سے لاکھ درجہ اچھے تھے آج کل کے مسلمانوں کو انھیں بُرا کہنے کا کوئی حق نہیں۔"

مخدوما! ان دو سطروں میں کئی غلطیاں ہیں۔ اول تو "لا یاتی علیکم زمان الا الذی بعدہ اشر منہ" کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ متقدم موخر سے افضل ہو مقصود من حیث القوم اور من حیث الاکثر ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بنی اُمیّہ کے زمانے میں جمعیت اسلام اور ممالک اسلامیہ اپنے بعد کے زمانے سے ہزار درجہ بہتر تھے۔ عرب کی اصلی سادگی اور آزادی ہر شے کے اندر نمایاں تھی صحابہ و تابعین و تبع تابعین کا گروہ عرصہ تک موجود رہا۔ عام خاندان اہلبیت مطہرہ اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام یکے بعد دیگرے موجود رہے۔ مسلمانوں کے اندر ولولہ اسلام اور جوش فتوحات بالکل تازہ اور عروج پر تھا، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن چونکہ فتنہ و فساد کے جراثیم پیدا ہو چکے تھے۔ اس لئے وہ بتدریج بڑھتے گئے۔ اور ہر آنے والا زمانہ گزشتہ زمانے سے بدتر ہوتا گیا یہاں تک کہ جو ہونا تھا ہوا، اور آج جو حالت ہے ظاہر ہے۔

پھر "بُرا کہنے" کے حق کی نسبت بھی حدود مقرر کرنے چاہئیں، ورنہ بیان کا مفہوم

واقعیہ تھا کہ عجم اشرار با وجود اور حقیقت اسلام کے جتھوں عروج کے ایسا شکر یادت تھا جس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے؟ یورپ نے مورخ حیران ہیں کہ باوجود ایسے مقالات عظیم کے کیونکر اپنے عہد ابتدائی میں اسلام کی ناکامی قوت قائم رہی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ نصرت تائید الٰہی و نصرت غیبی کا اعجاز تھا۔

۱۰۔ جناب نے یہ بھی ارقام فرمایا ہے کہ:

"آپ کی ان تلخ کلامیوں نے "رفاض" کی یاد تازہ کر دی جنہوں نے صحابہ کو سب و شتم کرنا اپنا پیشہ بنا لیا ہے"

لیکن اگر اعمال مروانیہ کو ظلم و جور کے لفظ سے تعبیر کرنا رفض ہے، تو میں بکمال مسرت و ابتہاج وہی کہوں گا، جو امام شافعی کی طرف منسوب ہے کہ:

فلیشهد الثقلان، انی رافضی

اور خوش ہوں گا کہ یہ ایک ایسا "رفض محبوب و مطلوب" ہے جس میں الحمد للہ میرے ساتھ وہ وہ لوگ شریک ہیں، جن کا نام آج دنیائے اسلام بغیر دعا و تحیت کے نہیں لیتی:

نازم بہ کفر خود کہ با یماں برابر است!

رہا تبرّہ اور سب و شتم، تو افسوس ہے کہ اس بدعت شنیعہ کی بنیاد اولیں بھی بنو امیّہ ہی نے رکھی، جو علانیہ بر سر منبر ذکر خدا و رسول کے ساتھ حضرت امیر پر لعنت بھیجتے تھے۔ اور اسی کا اتباع ہے، جو شیعی دنیا بدبختانہ کر رہی ہے۔

وفد بکارۃ الہلالیہ علی معاویہ:

۱۱۔ جناب نے آخر میں الہلال کے مضمون زیر نقد کے ایک جملے کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور لکھا ہے:

"ستم تو یہ ہے کہ جناب ان کے اسی "ضرب المثل حلم" اور ساٹھ برس کی بڑھیا عورت کے ہفوات سے درگذر فرما جانے کو خدا جانے کن نگاہوں سے ملاحظہ فرماتے ہیں؟"

قال لعمار: تقتلک الفئة الباغیة (بخاری و مسلم)
دیکھتا ہوں کہ تجھے ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔

حافظ سیوطی اس حدیث کو نقل کرکے لکھتے ہیں:

هذا الحدیث متواتر، رواه من الصحابة بضعة عشر کما بینت ذالک الاحادیث المتواتر (خصائص کبری جلد ۲۔ صفحہ ۱۴۰)

یہ تو صحیحین کی حدیث ہے، لیکن امام احمد و حاکم اور طبرانی نے عمرو ابن العاص سے روایت کی ہے کہ "سمعت رسول الله (صلعم) یقول: اولعت قریش بعمار قاتل عمار و سالبه فی النار"۔

یہ احادیث صفین کے اہل شام کی نسبت قرار دی جاتی ہیں، پھر انصاف فرمائیے کہ میں نے اگر عام حکومت بنی امیہ کی نسبت ظلم کی نسبت دی، تو میرے اس جرم کے دیگر شرکاء کو کیوں فراموش کردیا جاتا ہے؟

جناب نے حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ تو قطعاً پڑھی ہوگی۔ قضاء کے ابواب میں کوئی اس قسم کی عبارت بھی جناب کو یاد ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں؟

یجوز تقلد القضاء من السلطان الجائر کما یجوز من العادل، لان الصحابة تقلدوا من معاویة... والتابعین تقلدوا من الحجاج (هدایة مطبوعه لکھنؤ ج ۲ ص ۱۱۰)	ظالم بادشاہ کی طرف سے قضا کا عہدہ قبول کرنا جائز ہے، چنانچہ صحابہ نے معاویہ کی جانب سے قبول کیا تھا، نیز حجاج سے تابعین نے۔

صاحب ہدایہ کے اس "لاابالانہ" طریق ذکر کی نسبت جناب کا کیا خیال ہے؟

میں سودہ بنت عمارہ، زرقا بنتِ عدی، اور بکارت الہلالیہ، عکرشہ بنت الاطش اور ام البراء بنت صفوان کا ذکر کیا ہے، جنھوں نے جنگ صفین میں شرکت کی تھی، اور حضرت امیر کی نصرت و حمایت میں جانبازانہ حصّہ لیا تھا۔ پھر امیر معاویہ کے تسلط کے بعد یہ لوگ مختلف تقریبات میں اس کے سامنے پیش ہوئے، اور ان کو امیر معاویہ نے وہ زمانہ یاد دلایا ہے۔ اس پر نہایت بے باکانہ وحق گویانہ حضرت امیر کے فضائل بیان کئے ہیں، اور تمام اہل دربار کو اپنی عظمت حق گوئی سے متحیّر و متعجب بنادیا ہے !!

از اں جملہ (بکارت الہلالیہ) کے وفد کا واقعہ نہایت مؤثر ہے، اور غالباً اس مضمون میں، میں نے اسی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

صاحب بلاغات النساء نے لکھا ہے کہ بکارت الہلالیہ بالکل بڑھاپے اور ضعف و ناتوانی کے عالم میں ایک مرتبہ امیر معاویہ کے دربار میں گئی۔ وہ اس قدر ضعیف تھی کہ دو عورتیں دو طرف سے اسے تھام کر لائی تھیں۔ وہاں مروان بن حکم اور عمرو ابن عاص بھی موجود تھے۔ انہوں نے امیر معاویہ سے کہا کہ "آپ نے اسے پہچانا؟ یہ وہ عورت ہے جس نے جنگ صفین میں ہم لوگوں سے مقابلہ کیا تھا اور یہ اشعار پڑھ پڑھ کر لوگوں کو سناتی تھی:

اتری ابن ھند للخلافۃ مالکا ۔۔۔ ھیھات ذاک وما اراد بعید

(بقیہ صفحہ سابقہ) خطبات اور بلاغات و نوادر کو بطرزِ احسن و تقسیم مواد و ترتیب ابواب جمع کیا ہے۔ اور اس بارے میں اس کا مطالعہ عقد الفرید و آغانی وغیرہ سے زیادہ مفید اور دلچسپ ہے، مصر میں چھپ گئی ہے۔ (منہ)

جناب کا یہ ارشاد الہلال کے مضمون زیر نقد کی اس عبارت کی طرف ہے:

"اگرچہ طرح طرح کی بدعات و محدثات کا بازار (خلفاء راشدین کے بعد) گرم ہو گیا تھا، تاہم چونکہ عہد نبوت کا فیضان روحانی اور تعلیم قرآنی کا اثر ابھی بالکل تازہ تھا، اس لئے پھر بھی "امر بالمعروف" کی آواز کی گرج کوفہ و دمشق کے ایوان و محل کو لرزا دیتی تھی۔ ساٹھ برس کی ایک بڑھیا عورت بر سر دربار بلائی جاتی تھی، اور امیر معاویہ کے سامنے بے دھڑک وہ اشعار بجوش و خروش کے ساتھ پڑھتی تھی، جن میں نہ صرف حضرت امیر علیہ السلام کے مناقب ہوتے تھے، بلکہ کھلے کھلے لفظوں میں بنی امیہ کے قبائح و مثالب بیان کئے گئے تھے۔ الخ (الہلال جلد ۲۔ نمبر ۱۔ صفحہ ۶)

اب اس وقت یاد نہیں آتا کہ اس مضمون میں کس عورت کی جرأت و دلیری و حق گوئی کی طرف اشارہ کیا گیا تھا، جو "ہفوات" سے ملقب ہونے کی مستحق قرار پائی ہے؟ امیر معاویہ کے سامنے اس طرح کی محب اہل بیت اور صداقت پرست و جرأت فرما عورتوں کے آنے، سوال و جواب میں خطبات بلیغہ و مؤثرہ دینے، اور اپنے اشعار مدحیہ حضرت امیر سنانے کے متعدد واقعات تاریخ، مختارات ادبیہ میں منقول ہیں، اور فی الحقیقت عرب کی آزادی، اسلام کی تعلیم حریت، اور قرون اولیٰ کے امر بالمعروف کی تاریخ میں، ان میں سے ہر عورت، شرف و احترام اور عظمت و کمال کا ایک درجۂ مخصوص و ممتاز رکھتی ہے۔

صاحب عقد الفرید اور امام ابو الفضل ابن طاہر نے "بلاغات النساء"[1]

---

[1] بلاغات النساء امام ابو الفضل احمد بن ابی طاہر بغدادی متوفی ۲۸۰ھ کی ایک نہایت دلچسپ کتاب ہے، جس میں جاہلیت و صدر اسلام کی مشہور عورتوں کے اقوال (باقی برصفحہ آئندہ)

اور صدق لہجہ کی ایک مثال عظیم اور اسوۂ حسنہ ہے۔ یہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ
کے بعد اس سامنے آئی تو امیر نے پوچھا:

"کیا تو وہی عورت نہیں ہے، جس نے ایام جنگ صفین میں یہ اشعار
کہے تھے؟

شمر کفعل ابیک یا ابن عمارۃ — یوم الطعان وملتقی الاقران
وانصر علیا والحسین ورھطہ — واقصد لھند وابنہا بھوان
ان الامام اخا النبی محمد — علم الھدی ومنارۃ الایمان
فقہ الحتوف وسر امام لوائہ — قدما بابیض صارم وسنان

سودہ نے کہا:

"اے اللہ! میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں، جو حق سے وقت پر پھر
جاتے ہیں، اور کذب گوئی کے لئے حیلہ طرازیاں کرتے ہیں۔ بے شک میں ہی
ہوں جس نے یوم صفین میں یہ اشعار کہے تھے!"

امیر نے کہا: "کیا شے تھی، جس نے ان اشعار کے کہنے پر تجھ کو آمادہ کیا؟"

سودہ نے بے باکانہ و مسلمانہ کہا:

"حب علی علیہ السلام، واتباع الحق، حضرت علی کی محبت، اور حق کی
پیروی!" (ایضاً صفحہ ۳۶)

(الہلال) میں (احرار اسلام) کا باب تاریخ السلام کے ایسے ہی امثال جلیلہ
کے احیاء و ذکر کے لئے تھا، مگر افسوس کہ ہجوم اشغال نے مہلت نہ دی کہ ایک
آدمی کیا کیا کرے!

منتك نفسك فى الخلاد ضلالة — اغراك عمرو للشقاء وسعيد

فارجع بانكد طائر بنحوسها — لاقت عليا اسعد وسعود

سعید بھی موجود تھا۔ اس نے کہا کہ اتنا ہی نہیں، بلکہ یہ اشعار بھی اسی کے ہیں:

قد كنت آمل ان اموت ولا ارى — فوق المنابر من امية خاطبا

فالله اخر مدتى، فتطاولت — حتى رايت من الزمان عجائبا

فى كل يوم لا يزال خطيبهم — وسط الجموع لآل احمد عائبا

یعنی میری آرزو تھی کہ مجھے موت آجائے، مگر اس وقت کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھوں، جبکہ بنی امیہ کا کوئی فرد منبر پہ خطیب نظر آئے! مگر افسوس کہ میری آرزو پوری نہ ہوئی، اور اللہ نے میری موت کے وقت کو بڑھایا۔ یہاں تک کہ آج میں زمانے کے انقلابات کے عجیب عجیب رنگ دیکھ رہی ہوں۔ مسجدوں کے منبروں پر بنی امیہ کے خطیب چڑھتے ہیں، اور آل محمد پر علانیہ لعن طعن کرتے ..... ہیں!!"

بکارہ سے ان بیانات کو سن کر امیر معاویہ نے کہا:

"یہ تیرے کتے مجھ پر حملہ کر رہے ہیں، اور میرا اعصاء دفاع ضعیف ہے کہ ان کو ہنکا نہیں سکتی۔ بیشک ان اشعار کی میں ہی مصنف ہوں۔ میں پسند نہیں کرتی کہ ان سے انکار کروں۔ اب میں واپس جاتی ہوں۔ سچ یہ ہے کہ امیر المومنین علی کے بعد زندگی میں کوئی خوشی نہیں۔" (بلاغات النساء۔ صفحہ ۴۰)

اسی طرح سودہ بنت عمارہ رحمہا اللہ کا واقعہ بھی مسلمانوں کے لئے حق گوئی

مخدوم من! معاف فرمائیے گا، عقاید نسفی ہی کے اندر سب کچھ نہیں ہے، اس سے باہر بھی ذرا اپنی نظر وسیع فرمائیے۔ حق کی بحث فریقانہ تعصبات سے ارفع و اعلیٰ ہے، اور اہل حق کا مسلک عدل و اعتدال، اور افراط و تفریط سے مجتنب ہونا چاہیئے۔ آپ کو میری اس تحریر میں "رفاض" کے سب وشتم کا طریقہ نظر آیا کہ بنو امیّہ کی بدعات کا ضمنی تذکرہ بھی آپ کے خیال میں مشرب "رفاض" ہے۔ نہیں سمجھتا کہ اس بارے میں کیا عرض کروں؟ تاہم اتنا عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ الحمدللہ، اہلبیت نبوت کی محبت سے تا بکفن الزام و ایمان اندوز ہوں، اور اس عالم میں ہوں کہ جب خدا کے حضور میں عبادت کے لئے جاتا ہوں، تو میری نماز بھی اس وقت تک پوری نہیں ہوتی، جب تک کہ آل محمد پر درود وسلام و تحیت کا ہدیہ پیش کش بارگاہ حضرت تبارک وتعالیٰ نہ کرلوں اللھم صل وسلم علی سیدنا محمد وعلیٰ اٰل محمد کما صلیت وسلمت علی ابراھیم وعلیٰ اٰل ابراھیم انک حمید مجید۔

یا اھل بیت رسول اللہ حبکم فرض من اللہ فی القراٰن انزلہ

کفاکم من عظیم القدر انکم من لم یصل علیکم لا صلوٰۃ لہ

میں تشہد میں درود کو اصطلاحی واجب نہیں بلکہ حقیقی واجب یعنی فرض ہی سمجھتا ہوں، فقال اللہ تعالیٰ ان نجعلنا علی اتباع الکتاب۔ وتربانا بحب اھل بیت النبی الکریم علیہ وعلیٰ اٰلہ وصحبہ ابدالصلوٰۃ والتسلیم

۱۲۔ آخر میں یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس قسم کے مباحث مذاکرہ کی نسبت ارباب عصر کی مختلف رائیں ہیں۔ بعض حضرات ان کو اس درجہ اہم

بہرحال اس مضمون میں یا سودہ کی طرف اشارہ تھا، یا بکارت الہلالیہ رحمہا اللہ تعالیٰ کی طرف۔ آپ اس کو ایک بڑھیا کے ہفوات" سے تعبیر کر کے شاید کوئی خوشی حاصل فرماتے ہوں گے۔ مگر یقین کیجیے کہ آپ کے الفاظ پڑھ کر میری آنکھوں سے تو آنسو نکل پڑے۔ فسبحان من لا یتغیر! ایک زمانہ تھا کہ ہم میں سے بڑھیا عورتوں کے اندر اسلام کا ایسا سچا اتباع، حق اور حریت کے ایسے گرانمایہ امثال، امر بالمعروف کا ایسا سچا ولولہ، اور آزادی و صداقت کی ایسی غیر متزلزل محبت تھی۔ اور ایک زمانہ آج کا ہے۔ جب کہ مردان اسلام، اور رجال علم و فضل ایسی مثالوں کا پیش کرنا ایک طرف رہا، ان کو "ہفوات" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں!!

اللہ اللہ! اس مقدس مسلمہ و مومنہ کا مقام عالی اور مرتبہ ارفع! جس کے دل کو خدا نے خاندانِ نبوت کی محبت و عشق کا کاشانہ بنایا، جس کو حق کی معیت کی توفیق ملی۔ جس نے اہلبیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت و نصرت میں اپنے سیف ایمان کے جوہر دکھلائے، اور جس کی حریت و آزادی، اور حق پرستی و صداقت پژوہی کو حکومت دمشق کی شوکت قیصری اور ابہت عجمی مرعوب نہ کر سکی! آپ اس کے کارنامہ حق پرستی کو ہفوات و ترہات کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیجیے لیکن مجھ کو تو اگر اپنی تمام زندگی میں ان "ہفوات" کی ایک مرتبہ پیروی کرنے کی بھی سچی توفیق مل جائے، تو اپنی قسمت پر ناز کروں کہ میری بخشش کا سامان ہو گیا!!

تو و طوبیٰ و ما و قامت دوست
فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

وزمِ انفعالِ سینہ کو روک دیا جائے، اور دفاترِ اخبار، و اسفارِ آثار کے دروازوں پر یک قلم قفل چڑھا دیا جائے۔

تاہم بحالتِ موجودہ میں اس کی بالکل ضرورت نہیں دیکھتا کہ ان مباحث میں اپنا اور ناظرین کا وقت ضائع کروں۔ وہ وقت کہ ہماری فرصتیں قلیل، اور ضرورتیں لاتعد و لاتحصیٰ ہیں۔ اور پھر یہ بحثیں تو ہماری زندگی سے وابستہ ہیں۔ لیکن پیش آنے والے حالات تو وہ ہیں، کہ ہماری زندگی ہی کو مشکوک، اور ہماری ہستی ہی کو معقود کر دینے والے ہیں۔

الہلال کی گذشتہ جلد کے اختتام، اور نئی جلد کے فاتحہ میں "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کی ذکر (اصل مقصود الہلال ہے) تاریخ کی طرف مختصر سا اشارہ کیا گیا تھا اور اس فصل مخصوص امتِ مرحومہ کی طرف توجہ دلائی تھی کہ ہر زمانے میں حکمتِ الٰہیہ نے احیاء شریعت و امر بالمعروف کے لئے برگزیدگانِ امت کو منتخب کیا، اور ان کے ذریعہ حق کا اعلان، اور باطل کا استیصال ظہور میں آیا۔ اسی ضمن میں یہ ذکر بھی آگیا تھا کہ اسلام کا اصلی دَور زندگی ابتدائی عہدِ راشد تھا، اور پھر اس کے بعد ہی بدعات و محدثات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ وہاں نہ بنی ہاشم اور نہ بنی اُمیّہ کے منازعات کا ذکر تھا اور نہ جمل و صفین کا۔ نہ تعیین تھی، اور نہ تشخیص۔ لیکن جناب نے اس طرف توجہ مبذول فرمائی، اور اس کو رسم سب و شتم، و اتباع "رفاض" و سب صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم) سے تعبیر کیا۔ ایسی حالت میں ضروری تھا کہ بسبیل اجمال اپنے خیالات ظاہر کروں۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ واقعات سے بالکل چشم پوشی کر لی جائے، اور یہ کیا استبداد و قہر، اور حکمِ بندشِ قلم و لسان ہے کہ ضمناً بھی کہیں صاحبانِ اعمال

اور اقدام سمجھتے ہیں کہ دین و دنیا کا کوئی خیال اور اسلام و مسلمین کی کوئی مصلحت ان کی نظروں میں اہم تر نظر نہیں آتی اور ان کے عقیدے میں اب مسلمانوں کے لیے اس کے سوا دنیا میں کوئی کام باقی نہیں رہا ہے کہ گذشتہ منازعات و مناقشات کی نسبت تصنیف و تالیف و جرح و تعدیل کا بازار گرم کیا جائے، اور قوم و ملت اپنی زندگی کو اس کے مطالعہ کے لیے وقف کر دے!!

ان بزرگوں کے ساتھ ایک دوسرا اور روشن خیال، اتحاد دوست اور "مصلحت" فرما طبقہ ہے، جس کا خیال ہے کہ اس طرح کے تمام مباحث چونکہ اس کی مصلحت "مصلحت وقت" کے خلاف ہیں، اس لیے بہتر ہے کہ ہمیشہ کے لیے ان کو مدفون... مقبرۂ ذہول و نسیان کر دیا جائے، اور کبھی ان کی طرف اشارہ بھی نہ ہو۔

گویا اس خیال کے بزرگوں کے نزدیک سیاہ و سفید، حق و باطل، صدق و کذب، نور و ظلمت، اور معروف و منکر کی بنیاد، حقیقت نہیں، بلکہ "مصلحت" ہے اور تمام تاریخی اسفار، اور مجلدات دنیا سے نابود کر دینا چاہئیں، کیونکہ وہ "مصلحت وقت" کے خلاف ہیں!!

لیکن اس عاجز کا مسلک ان دونوں مذاہب سے مختلف ہے۔ میں دونوں جماعتوں کو افراط و تفریط میں دیکھتا ہوں۔ اپنی تمام قوت علم و دین کو محض تاریخی مجادلہ و مکابرہ کرنا، اور اور منازعہ کو خواہ مخواہ زندہ کر کے امن و اتحاد و جمعیت کلمہ میں خلل انداز ہونا عقلاً و شرعاً دونوں کے لحاظ سے مضر ہے، لیکن ساتھ ہی میں اس "مصلحت اندیشی" کا بھی قائل نہیں، جس کے معنی یہ ہیں کہ تاریخی مباحث و تحقیقات کا سد باب کر دیا جائے۔ تصحیح خیال، تعدیل اعتقاد، تکمیل ایمان، تسنم

یہ سوال اگرچہ زمانہ قدیم میں بھی فلسفہ اجتماع کا ایک معرکۃ الآرا مسئلہ رہ چکا ہے۔ لیکن موجودہ عہد سے بڑھ کر اس کے درس کے لئے اور کون سا وقت موزوں ہوگا؟

مخالفین جنگ و امیدواران صلح عام:۔

جو لوگ دنیا کے لئے صلح و سلام کو مفید سمجھتے ہیں، ان کا استدلال یہ ہے کہ انسان فطرتاً اتحاد و اتفاق کا طالب ہے۔ ابتداء میں انسان کا ہر فرد دوسرے فرد سے الگ تھلگ رہتا تھا، لیکن دنیا کے تمام مادوں کی طرح قوت جاذبہ اس میں بھی موجود تھی، اس لئے اس نے ان بکھرے ہوئے ذرّوں کو جمع کرنا شروع کیا، پہلے چھوٹے چھوٹے خاندان قائم ہوئے، پھر خاندان نے ترقی کر کے قبائل کی صورت اختیار کر لی۔ رفتہ رفتہ مستقل جماعتیں پیدا ہوگئیں۔ اور جماعتوں کی وحدت نے قومیت کا نظام قائم کر دیا۔ اس طرح گاؤں سے شہر اور شہروں سے عظیم الشان ملک آباد ہوگئے۔

لیکن یہ فطری اتحاد محض بحث و اتفاق کا نتیجہ نہ تھا، بلکہ علل و اسباب کے شکنجہ میں جکڑا ہوا تھا۔ دنیا کا ایک ذرّہ بھی دوسرے ذرہ سے بغیر کسی طبعی مناسبت کے نہیں مل سکتا۔ اس لئے انسان کا ایک فرد بھی دوسرے فرد سے صرف اس بنا پر نہیں ملا کہ وہ اسی کی طرح ایک انسان تھا، بلکہ جذبات و خیالات کی یک رنگی اور اور مقاصد و اغراض کی یک جہتی نے ان میں باہم کشش پیدا کی، اور وہ انہی نقطوں پر آ کر باہم مل گئے۔ ایک متمدن انسان اپنے بھائی سے لے کر ایک غیر ملک کے باشندہ سے تک تعلقات رکھتا ہے۔ لیکن ان تعلقات میں جو عظیم الشان

جنگ اور صلح

دُنیا کا مادہ قوائے متضاد کا گہوارہ ہے۔ ایک طرف تو اس کا ایک ذرہ متحرک پراگندہ اور ایک عام ہیجان کی حالت میں نظر آتا ہے۔ دوسری طرف وہ منجمد ہو کے سمٹتا ہے۔ سمٹ کے باہم ایک دوسرے سے ملتا ہے۔ مل کر سکون و استقرار حاصل کر لیتا ہے!!

اس بناء پر وہ تمام کیفیات متضادہ کی طرح جنگ و صلح کی بھی یکساں قابلیت رکھتا ہے وہ جنگوں کے اختلال و تصادم کی شکل میں سمندر کی لہر ہے تو صلح و سکون کی حالت میں اس کی سطح ہموار و ساکن! لیکن سوال یہ ہے کہ ان دونوں حالتوں میں انسانیت کے بقاء و ارتقاء سعادت ارضی کے حصول، تمدن و تہذیب کی ترقی، علوم و فنون کی اشاعت، قویٰ و جذبات کی تنشیط، اور قوت عمل کی تنظیم و تحریک کے لئے کون زیادہ مفید ہے؟

ضرورت نہیں ۔ اب خود زبان نے تلوار سے زیادہ جوہر پیدا کر لئے ہیں۔

صنعت و حرفت کی ترقی اور تجارت کی گرم بازاری نے دنیا کے دو ملکوں کو ایک ہی گھر کے دو صحن بنا دیا ہے۔ یہی اختلاط و امتزاج نے دو قوموں کے جذبات میں کمال یک رنگی و یک راہی پیدا کر دی ہے ۔ اور ان کے مقاصد و اغراض بالکل توام ہو گئے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے کسی ایک حصہ میں جب جنگ چھڑ جاتی ہے، تو ہر ملک اس سے متاثر ہو جاتا ہے۔ جب دنیا اس قدر متحد الاغراض ہو گئی ہے تو کیوں نہ سب صلح اور امن کے لئے متفق ہو جائیں؟

قدیم زمانہ میں جنگ انسان کا ذریعہ معاش تھی ، یہاں تک کہ بعض لوگ لڑائیوں میں باجرت شریک ہوتے تھے ۔

لیکن اب وہ اقتصادی حیثیت سے کوئی ذریعہ معاش نہیں خیال کی جاتی ۔ اب انسان کا رزق نیزے کی نوک کے ساتھ بندھا ہوا نہیں ہے ، بلکہ کارخانوں کی مشینوں کے ساتھ متعلق ہے ۔ لیکن زمانہ جنگ میں تجارت و صنعت کا بازار اس قدر سرد پڑ جاتا ہے کہ یہ پرزے زنگ آلود ہو جاتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ زمانۂ جنگ میں تمام ملک دفعتاً فقر و فاقہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ بالخصوص تاجروں کا گروہ تو جنگ کا نام سن کر کانوں پہ ہاتھ دھرتا ہے، اور قیام امن کے لئے جان و مال تک سے دریغ نہیں کرتا۔

اب جنگ کے عواقب وخیمہ و نتائج المیہ اس درجہ آشکارا ہو گئے ہیں کہ خود سپہ سالاران فوج بھی اس کو دنیا کی بدترین چیز سمجھتے ہیں ۔ جنرل

فرقِ مدارج نظر آتا ہے، وہ انہی اغراض و مقاصد کے اختلاف کا نتیجہ ہے، اگر دو بھائیوں کے تعلقات میں ایک غیر منقطع اتصال) و استحکام نظر آتا ہے، تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ان کے جذبات و خیالات اور اغراض و مقاصد نہایت کے ساتھ باہم دست و گریباں ہیں۔

انسان نے آغازِ خلقت میں بھی انہی اغراض کو نصب العین بنا کر دوسرے انسانوں سے سلسلۂ ارتباط و اتحاد پیدا کیا، اور انہی اغراض کے تصادم و مقاومت نے جنگ کی بنیاد ڈالی۔ آج بھی انہی اسباب کی وجہ سے عظیم الشان لڑائیاں قائم ہوتی ہیں۔

لیکن اب زمانہ نے بہت کچھ ترقی کر لی ہے۔ اتحاد و اتفاق کے وسائل بکثرت مہیا ہو گئے ہیں، فطری احساس کے ساتھ تہذیب و تمدن نے بھی صلح کے فوائد کو عام طور پر ذہن نشین کر دیا ہے۔ اس بنا پر انسان کے جذبات و خیالات اور اغراض و مقاصد کو یقیناً متحد کیا جا سکتا ہے، اور ان اتحاد میں اس شدت کے ساتھ اتصال پیدا ہو سکتا ہے کہ دو مختلف ملکوں کے باشندے دو بھائیوں کی طرح زندگی بسر کریں۔

اگرچہ کبھی کبھی اتحاد ہی اختلاف پیدا کر دیتا ہے، لیکن جس طرح افراد کے اختلاف کو چھوٹی چھوٹی عدالتوں کے ذریعہ مٹا دیا جاتا ہے، اسی طرح قومی دنگی اختلافات کو بھی ایک وسیع عدالت اور ایک ظالم حکم کے ذریعہ سے ارشاد کیا جا سکتا ہے۔ وحشی قومیں اختلافات و نزاعات کی حالت میں زبان تیغ سے اپنا فیصلہ سننا چاہتی تھیں، مگر بیسویں صدی کے تمدن انسان کو عہدِ وحشت کی تجدید کی

پر فخر کیا کرتے تھے۔ اب ہر متمدن انسان کو اس سے شرم آتی ہے۔ پہلے جانوروں کے لڑانے کے لئے خاص خاص میدان متعین کئے جاتے تھے، اور اس طرح جانوروں کو سخت اذیت پہنچا کر لطف اندوزی کا سامان بہم پہنچایا جاتا تھا۔ اب جانوروں کو انسان کے ظلم و جور سے بچانے کے لئے متعدد انجمنوں کی بنیاد پڑ گئی ہے، اور انسان کے دائرۂ لطف و کرم میں بے زبان مخلوقات تک شامل ہو گئی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ انسان کے مختلف طبقات فطرتاً باہم متحد نہیں ہو سکتے اور اس فطری اختلاف کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ کوئی ایسا جامع اور عام قانون نہیں بنایا جا سکتا جس پر ہر سلطنت اور ہر ملک و قوم کا اتفاق ہو۔

لیکن اب تو سلطنتیں اس اتفاق عام کی طرف قدم بڑھا چکی ہیں۔ اور جس چیز کو قانون شکن کہا جاتا تھا وہ خود پابند قانون ہو گئی ہے۔ یعنی خود جنگ کے لئے ایک بین الملّی قانون بنا دیا گیا ہے۔ جس پر تمام سلطنتوں نے اتفاق کر لیا ہے۔

قدیم زمانے میں جنگ وحشت کا ایک بدنما موقع تھی، جس میں صرف بغض، انتقام، توہین و تذلیل کا رنگ نظر آتا تھا، اسیرانِ جنگ کو عموماً قتل کر دیا جاتا تھا ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے جاتے تھے، اور دشمن کو ہر ممکن طریقے سے ضرر پہنچایا جاتا تھا، لیکن اب تمام مہذب سلطنتیں اس وحشت اور بہیمیت کے تصور سے لرز جاتی ہیں، اور حتی المقدور جنگ کے مصائب کے کم کرنے میں اپنی کوششوں کو صرف کر رہی ہیں۔ لیکن چونکہ جنگ میں سنگدلی اور قساوت قبیلہ سے بالکلیہ

مسٹر چارلس ایغبیر نے جنگ کی ہولناک صورت کو ایک نہایت بلیغ تشبیہ میں عریاں کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

ایک فوجی آدمی کی زندگی اس رقاصہ کے مشابہ ہے جو کسی ایسے ہال میں ناچتی ہے جس کی دیواروں میں ٹوٹے ہوئے شیشے کے ٹکڑے جڑے ہوتے ہوں۔ جب وہ عالمِ نشاط و سرور میں مستانہ وار رقص کرتی ہوئی ان دیواروں تک پہنچتی ہے، تو اس کے اطراف و اعضاء شیشے کے ٹکڑوں سے لگ کر اور مجروح ہو کر خون آلود ہو جاتے ہیں، اور ناز و غرور کے جو پردے اس کی آنکھوں پر پڑے ہوئے تھے، دفعتاً اتر جاتے ہیں۔ اس کو نظر آنے لگتا ہے کہ وہ ایک سخت فریب میں مبتلا تھی، اسی طرح فوجی آدمی میدانِ جنگ کی طرف ہتھیاروں کی سراب آسا چمک دیکھ کر نہایت خنداں و فرحاں روانہ ہوتے ہیں، لیکن چند ہی دنوں کے بعد ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں، اور ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ جوہرِ تیغ کی چکا چوند نے ان کو اندھا بنا دیا تھا۔ اسی بناء پر میں اس راہ کو صاف و روشن نہیں دیکھتا۔ مجھے اس میں خون اور کانٹوں کی وسیع چادر بچھی ہوئی نظر آتی ہے!"

نیز وہ کہتے ہیں کہ اب انسان کا اخلاقی معیار روز بروز بلند ہوتا چلا جاتا ہے، ظالمانہ وحشت کی بے رحمیاں اور دورِ جاہلیت کی ظالمانہ رسمیں مٹتی جاتی ہیں۔ ان کی جگہ مراعات اور ایثار نفسی و فیاضی کا عام میلان پیدا ہو جاتا ہے۔ زمانہ قدیم میں جنگ ایک فعلِ ممدوح خیال کی جاتی تھی، لیکن اب اس کو سخت معیوب خیال کیا جاتا ہے۔ آج سے چند دن پہلے لوگ مینڈھوں کے لڑانے

کے سینے کے اندر یہ آتشکدہ نہ بھڑکتا ہو۔ اس بنا پر صلح عام کا انعقاد بظاہر ناممکن معلوم ہوتا ہے، لیکن ایک زمانے پر دوسرے زمانے کو قیاس کرنا غلطی ہے۔ قدیم زمانے میں تمام قومیں ایک انسان کے شخصی ارادہ کے جال میں گرفتار تھیں، اور وہ اپنی ذات پر قوم کے تمام مصالح و اغراض کو قربان کر دیتا تھا۔ لیکن اب ہر قوم مستقل بالذات ہو گئی ہے، اور اس نے خود بادشاہوں کے جبر و سطوت کو اپنا تابع بنا لیا ہے۔ اب دنیا قہر و استبداد کے پنجۂ آہنیں سے نکل گئی ہے۔ اور اپنے مصالح و فوائد کو سب سے زیادہ عزیز رکھتی ہے۔ یہی مصالح ایک قوم کو دوسری قوم سے ملاتے جاتے ہیں۔ گرد و کدورت کا جو پردہ درمیان میں قائم ہو گیا تھا وہ اٹھتا جاتا ہے۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں سے زیادہ کون قوم بغض و عداوت کے نشے میں سرشار تھی؟ لیکن مصالح نے رفتہ رفتہ دونوں قوموں کو متحد کر دیا، اور آج فرانسیسی اور انگریزی فوج میدان جنگ میں دوش بدوش کھڑی ہو کر لڑ رہی ہے۔ جرمنی اور فرانس اگرچہ آج ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں، لیکن ہم کو وقتی اسباب کے اثر سے مرعوب ہو کر مصالح کی لازوال قوت کا انکار نہ کر دینا چاہیئے۔ ممکن ہے کہ ایک دن جرمنی بھی انگلستان بن جائے۔

اُن کا آخری استدلال یہ ہے کہ جنگ کے علل و اسباب کی قوت روز بروز گھٹتی جاتی ہے، اور صلح و اتحاد کے ذرائع وسیع اور ترقی پذیر ہوتے جاتے ہیں، بالخصوص بعض اسباب ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو دنیا کو اتفاق عام کی دعوت دے رہے ہیں۔

اجتناب نہیں کیا جا سکتا، اس لیئے ایک ایسا معتدل قانون وضع کر دیا گیا ہے جس پر عمل کرنے سے جنگ کا مقصد بھی حاصل ہو سکتا ہے اور وحشیانہ اعمال سے بھی احتراز کیا جا سکتا ہے۔ اس قانون کی رو سے بہت سے ہتھیاروں اور بعض خاص اقسام کے گولوں کا استعمال ناجائز قرار دے دیا گیا ہے اور زخمیوں اور قیدیوں کے ساتھ رفق و ملاطفت کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اگر متخاصمین جنگ میں کوئی فریق اس قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے اور دوسرا فریق بھی اسی طریقہ سے اس کا مقابلہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، تو تمام سلطنتیں خود ان کے مقابلہ کے لیئے کھڑی ہو جاتی ہیں، اور عالم تمدن کی بہترین ہمدردی ان کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کی تمام قومیں ایک اخلاقی، تمدنی اور قانونی رشتے میں منسلک ہو گئی ہیں، اور اس نظام نے ایک قوم کو دوسری قوم کے شدائد و مصائب کا متکفل اور ذمہ دار بنا دیا ہے، قبائل اور خاندانوں نے اسی قسم کے نظام اتحاد کے ذریعہ قومیت کی صورت اختیار کر لی تھی، اس لیئے اتفاق کے ان آثار و علائم سے توقع کی جاتی ہے کہ اب دنیا کی قومیت کا مفہوم پہلے سے بھی زیادہ وسیع ہو جائے گا اور تمام قومیں اس کے دائرے میں داخل ہو جائیں گی۔ یہاں تک کہ بالآخر ایک دن ایک فیاض قانون خود جنگ ہی کا انسداد کر دے گا۔ بہر کیف منافذ جب ایک ایک کر کے بند ہو جاتے ہیں، تو اس کا طبعی نتیجہ بجز اس کے اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ ایک دن نہری خشک ہو جائے۔ اس اتفاق عام کی یہ آخری منزل ہوگی، اور عنقریب اسی نقطہ پر مصالحت عامہ کا سفید جھنڈا لہرائے گا۔

بغض و انتقام جنگ کا مبداء اول ہیں، اور دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جس

گئی، جس میں ہر سلطنت کے عمّال شریک ہوتے اور اس کی ممبری قبول کی۔
اس انجمن کا مقصد یہ تھا کہ تمام سلطنتوں کے ارکان و عمّال اور اعضاءِ
حکومت میں باہم رابطۂ اتحاد قائم ہو جائے۔

جو سلطنتیں صلح جو اور امن طلب تھیں انھوں نے اس کو اور وسعت
دی۔ چنانچہ ولایت متحدہ امریکہ میں ایک عظیم الشّان انجمن قائم کی گئی جس
کا مقصد یہ تھا کہ تمام سلطنتوں کے کارکن لوگوں کو باہم اس قدر متحد ہونا
چاہیئے کہ اگر ایک سلطنت دوسری سلطنت کے مقابلے میں آمادۂ جنگ
ہو تو دونوں سلطنتوں کے عمّال اپنے اپنے کام سے علٰحدہ ہو جائیں۔ اس
کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ سلطنتیں ایک دستِ شل بن کر رہ جائے گی۔

۴۔ ان ذرائع کے علاوہ یورپ اور امریکہ میں سینکڑوں انجمنیں خاص اسی
غرض سے قائم ہو گئی ہیں کہ دنیا کو امن و صلح کی دعوت دیں، اور سیاسی و قومی
اختلافات کو مٹائیں۔ اس مقصد کے لئے جو قوانین بنائے جاتے ہیں وہ بجائے
خود موثر ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ ان کا اثر اخلاقی پڑتا ہے اور جو صدائیں انجمنوں
سے بلند ہوتی ہے، وہ صرف شرکاءِ کانفرنس ہی کے دلوں میں جذبۂ مودّت
نہیں پیدا کرتی، بلکہ کانفرنس کے ہال سے باہر نکل کر تمام دنیا کو محیط ہو جاتی
ہے، اور ہر شخص کے دل میں محبّت کا بیج بو دیتی ہے، اس کا نتیجہ یہ نکلا
ہے کہ ایک عام کانفرنس صلح قائم ہو گئی ہے، اور جرمنی، آسٹریا،
روس، اٹلی، اسپین، انگلستان، غرض تمام ملکوں میں مقامی انجمنیں بھی قائم
ہیں جو اس کانفرنس کے مقاصد کی تائید کرتی ہیں۔

۱ ۔ علوم وفنون کی ترقی اور ایجادات واختراعات کی وسعت نے ہر ملک کے علماء کو ایک دوسرے کا دوست بنادیا ہے۔ بالخصوص علوم طبیعیہ اور علم طب نے تو تمام دنیا کو ایک مرکز پر جمع کر دیا ہے۔ ان علوم کا مقصد بالذات اگرچہ قیام امن وانعقاد صلح نہیں ہے، لیکن ان کی ترقی واشاعت کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے، اس سے اتفاق واتحاد کا مقصد نہایت آسانی کے ساتھ حاصل ہو سکتا ہے۔ ہر ملک میں ان علوم کی ترقی و استحکام کے لئے عظیم الشان کانفرنسیں قائم کی جاتی ہیں۔ ان میں ممالک مختلفہ کے علماء بلکہ سلاطین و وزراء تک شریک ہوتے ہیں، جن کے یکساں نصب العین میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔

نمائشوں کے ذریعہ سے بھی یہ مقصد نہایت وسیع پیمانے پر حاصل ہوتا جاتا ہے۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں نے لندن میں تین سال تک جو نمائش قائم رکھی تھی اس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس نے دونوں قوموں کے اتحاد میں بڑی مدد دی ہے۔

۲ ۔ ملکی اتفاق اور قومی اتحاد کا ایک بڑا ذریعہ سلاطین، وزراء اور ارکان دولت کی باہمی ملاقات بھی ہے، اور یہ ذریعہ اس زمانے میں نہایت عام ہو گیا ہے۔ فرانس اور انگلستان میں اسی طریقہ سے اتحاد پیدا ہوا، اور روس نے بھی انگلستان سے اسی طرح رسم مودت قائم کی۔

ابتداء میں تو اس کو ایک رسمی چیز سمجھا جاتا تھا۔ لیکن بعض غیر متوقع نتائج نے اس کو اس قدر ترقی دی کہ اسی غرض سے ایک عام انجمن قائم کی

ہیں، ہزاروں عورتیں بیوہ ہو جاتی ہیں، قبیلے کے قبیلے، خاندان کے خاندان جلاوطنی اختیار کر لیتے ہیں۔ اس طرح ایک ملک کی گود دفعتاً اپنے فرزندوں سے خالی ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ توالد و تناسل پر عیش و راحت اور امن و صلح کا اس سے بھی زیادہ مضر اثر پڑتا ہے۔ جو قومیں جس قدر زیادہ جنگجو ہوتی ہیں اسی قدر کثیر اولاد بھی ہوتی ہیں۔ برخلاف اس کے عیش پسند، صلح جو اور امن دوست قوموں میں بچوں کی تولید عموماً کم ہو جاتی ہے۔ عرب عموماً جنگجو تھے لیکن ان میں بچوں کی کثرت تھی۔ فرانسیسیوں سے زیادہ عیش پرست کون سی قوم ہوگی؟ لیکن وہاں کی آبادی روز بروز گھٹ رہی ہے۔ جرمنی کو ایک جنگجو ملک کہا جاتا ہے، لیکن جس زمانے میں اس نے یہ خطاب عام طور پر حاصل کیا ہے اسی وقت سے اس کی مردم شماری نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ جانور تک اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ شیر اپنے کٹہرے میں بہ نسبت جنگل کی خاردار جھاڑیوں کے زیادہ امن و سکون سے زندگی بسر کرتا ہے، لیکن اس کا گہوارۂ عیش میں اس کا سلسلۂ توالد و تناسل دفعتاً منقطع ہو جاتا ہے۔ قبائل اور عام تمدنی جماعتوں کی ترقی صرف کثیر نسل پر موقوف ہے، اور جنگ اس تمدنی نظام کو صلح سے زیادہ وسعت کے ساتھ قائم رکھ سکتی ہے۔

بدقسمتی سے اگرچہ ایک مدت سے جنگ ہوا پرستی، شہرت طلبی، اور خود غرضی کا ذریعہ بنا لی گئی ہے اور عموماً سلاطین و امرائے فوج صرف اپنے جاہ و اقتدار کے قائم رکھنے کے لیے جنگی جہاز تیار کراتے ہیں، توپیں ڈھالتے ہیں، تلوار پر صیقل چڑھاتے ہیں، اور فوجوں کو آگ اور خون کے طوفان میں جھونک دیتے ہیں۔ لیکن جنگ

۴۔ ایک خاص قانون ساز کانفرنس بھی قائم کی گئی ہے جس کے ممبر قانون کے بڑے بڑے فضلاء ہیں اور جو خاص طور پر ایسے قانون وضع کرتی ہے جو مختلف سلطنتوں کے مفاد کو باہم ٹکرانے نہیں دیتے۔ یہ کانفرنس ۱۸۷۳ء میں مسیو رولاں فرانسیسی کی کوشش سے قائم ہوئی، اور رفتہ رفتہ امریکہ اور سوئٹزرلینڈ نے بھی اس کی تقلید کی۔

۵۔ مختلف ممالک کی پارلیمنٹوں کے ممبروں کی کانفرنس ان سب سے الگ ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اختلافات و منازعات کا فیصلہ صرف حکم (پنچایت) کے ذریعہ سے کیا جائے۔

۶۔ سوشیالوجسٹ لوگوں کا ایک خاص فرقہ پیدا ہو گیا ہے، جو ہمیشہ تعاون اجتماع اور مصالحت عامہ کی تائید میں سرگرم رہتا ہے۔ یورپ میں ان کی تعداد آٹھ ملین ہے، اس لئے جنگ کی طرح صلح بھی اپنے ساتھ جانباز سپاہیوں کی ایک فوج گراں رکھتی ہے۔

منکرین صلح عام و مؤیدین جنگ:۔

لیکن مؤیدین جنگ ان دلائل کے آگے نہیں جھکتے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان دلائل کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ انسان کی ایک غیر محدود تعداد کو فطرتاً عیش و عشرت اور سکون و اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہیئے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس کثیر التعداد عیش پرست انسان آغوشِ صلح میں پیدا بھی ہو سکتے ہیں یا نہیں؟

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جنگ کی وجہ سے دنیا افزائش نسل انسانی میں ایک نمایاں تنزل پیدا ہو جاتا ہے۔ لاکھوں نوجوان لقمۂ تیغ و سناں ہو جاتے

میدانِ جنگ میں نہایت خوفناک نظر آتی ہے۔ جنگ بے رحمی کے ساتھ جذبۂ رحم و محبت کو بھی پیدا کر دیتی ہے، اور چونکہ زمانۂ جنگ میں تمام قوائد و جذبات متحرک رہتے ہیں، اس لئے ہر جنگجو قوم ان چیزوں کو نہایت سرعت کے ساتھ قائم کر لیتی ہے۔ تمدن نے ہمیشہ جنگ کے ساتھ ساتھ ترقی کی ہے، عیش پرستی نے اس میں ایک دوسرے کا بھی اضافہ کیا ہے۔

آج ملکوں اور سلطنتوں میں اتفاق و اتحاد کے جو ذرائع پیدا ہو گئے ہیں وہ بھی جنگ ہی کی برکت ہے۔ واقعات ثابت کر رہے ہیں کہ یہ جو کچھ تھا، خوف، بزدلی مصلحت، ریاکاری، ڈپلومیسی کا نتیجہ تھا۔ خلوص صرف میدانِ جنگ ہی میں نظر آسکتا ہے، اور ہم کو خلوص ہی کی جستجو کرنی چاہیئے۔

○

کہ نفس حقیقت پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔ امن و صلح کو بھی اسی طرح اغراض فاسدہ کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔ بہت سے لوگ صرف عیاشی و کاہلی کے لئے اطمینان و سکون اور صلح و سلام کی زندگی کے طالب ہوتے ہیں۔

خدا نے انسان میں بغض و انتقام کا مادہ صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ اپنے حقوق کی حفاظت کرے، اور انتخاب طبیعی اور بقائے اصلح میں فطرت کا معاون و مددگار ہو، پس جنگ کا فطری مقصد یہی ہے اور اس قسم کی لڑائیاں ہمیشہ دنیا کے لئے آگ اور خون کے ظاہری پردے میں ابر رحمت کا چھینٹا ثابت ہوتی ہیں۔ جو لوگ میدان جنگ میں جانبازانہ لڑتے ہیں، وہ کسی قوم کے فنا کرنے میں انتخاب طبیعی کو مدد ہی نہیں دیتے بلکہ وہ اپنے آپ کو اصلح بھی ثابت کر دیتے ہیں اور اپنے اندر بقا و قیام کی صلاحیت پیدا کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ خود انتخاب طبیعی اور بقاء اصلح کی حقیقت، اس کے وقت، اور طریق انتخاب سے واقف نہ ہوں، تاہم قوت و صلاحیت کا احساس صحیح خود کسی قوم کے صالح ہونے کی دلیل ہے، اور دنیا کو اب تک اسی احساس نے قائم رکھا ہے۔ پس اسی قوت و احساس صحیح کا اندازہ صرف میدان جنگ ہی سے ہو سکتا ہے۔ کوئی قوم میدان جنگ میں انتخاب طبیعی کا فرض ادا کرنے خود نہیں جاتی بلکہ وہ فطرت کے سب سے بڑے امتحان گاہ میں لے جا کر کھڑی کر دی جاتی ہے۔ اگر اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہے تو زندہ رہتی ہے، ورنہ انتخاب طبیعی کا اسلحۂ جنگ اس کو فنا کر دیتا ہے۔

جس اخلاقی شجاعت کے کارنامے ہسپتالوں، کالجوں اور یتیم خانوں کی صورت میں نظر آتے ہیں وہ بھی اسی وحشیانہ شجاعت کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے۔

ہمالیہ تو دنیا کا سب سے بڑا پہاڑ ہے، تو تند و تیز ہوا روک دیتا ہے تو غیض و غضب کے بادل ٹھکرا کر پیچھے ہٹا دیتا ہے، کیا تو ہمارے شدائد و مصائب کا طوفان نہیں روک سکتا، کیا تو ہمارے حزن و غم کے بادل کو ٹھکرا کر پیچھے نہیں ہٹا سکتا۔

برٹش حکومت کہتی ہے کہ رعایا کے مذاہب کا احترام ہوگا، لیکن کیا وہ احترام اس سے بھی کم ہوگا جتنا ایک سڑک کے سیدھے ہونے کا، برٹش حکومت کہتی ہے کہ رعایا کے خون کا احترام ہوگا۔ لیکن کیا اس سے بھی کم جتنا ایک بنئے کی زینت و آرائش کا۔

سوا اگست کی صبح انقلاب۔ حکومت برطانیہ کی بربریت ہے، بہادر سپاہی جس وقت ایک ضعیف و ناتواں و غیر مسلح مجمع پر گولی برسا رہے تھے انہیں کیا خبر تھی کہ یہ گولیاں ان ناتواں انسانوں کے سینوں کو توڑ توڑ کر برطانوی عدل و انصاف کو زخمی کر رہی ہیں؟ انہیں کیا معلوم تھا کہ گولی کا نشانہ اس ستون کو کمزور کر رہا ہے جس پر حکومت برطانیہ کی عمارت قائم ہے، وہ مسرور ہیں کہ ہم وفاداری کی خدمت ادا کر تے ہیں، نادانو! تم اس سے عداوت کر رہے ہو جس کی محبت کا اظہار چاہتے ہو۔

وہ کیا عجب منظر تھا جب کربلائے کانپور میں کئی ہزار بے خانماں رعایا برطانی رعایا برہنہ سر و برہنہ پا اور یا چشم پرنم و با دل پرغم ایک سیاہ علم کے نیچے جو اسلام کی مظلومی و بےکسی کا نشان تھا، کئی سو معصوم بچوں کے ساتھ خون آلود نعشوں اور پتھروں کا ڈھیر لگا رہی تھی اور اس کی زبان پر وہ دعا جاری تھی جو وقت تعمیر کعبہ ابراہیم و اسمٰعیل کی زبان پہ جاری تھی۔

یہ پہلا تو مقدس نظارہ ختم نہیں ہوا تھا کہ مسٹر ٹائلر مجسٹریٹ کانپور کی سالاری میں تخفۂ سوار اور پیدل فوج تمام اسلحہ سے مسلح نمودار ہو جاتی ہے اور دس منٹ

شہدائے کانپور

زمین پیاسی ہے، اس کو خون چاہیئے۔ لیکن کس کا؟ مسلمانوں کا، طرابلس کی زمین کس کے خون سے سیراب ہے؟ مسلمانوں کے، مغرب اقصیٰ کس کے خون سے رنگین ہے؟ مسلمانوں کے، ایران پر کس کی لاشیں تڑپتی ہیں؟ مسلمانوں کی، سرزمین بلقان میں کس کا خون بہتا ہے؟ مسلمانوں کا۔ ہندوستان کی زمین بھی پیاسی ہے، خون چاہتی ہے، کس کا مسلمانوں کا، آخرکار سرزمین کا چھینٹہ پر خون برسا اور ہندوستان کی خاک سیراب ہوئی۔

ہندوستان کی دیوی جوش و خروش میں ہے، اپنے قربان گاہ کے لئے نذر مانگتی ہے، کون ہے ہمت کا جوان جو اس کی خواہش پوری کرے، صوبہ متحدہ کا بادشاہ (مسٹر جیمس مسٹن) بالآخر بادشاہ کے آگے بڑھا اور اس نے اپنی وفادار رعایا (مسلمان) کا خون پیش کیا جو اپنی جان کے بعد اس کو سب سے زیادہ عزیز اور محبوب تھی۔

مسلم سمجھتی تو اب کہاں بسے گی؟ کہ تیرے لئے ہندوستان بھی امن کا گھر نہیں رہا، وہ جس کو تو سب سے بڑی اسلامی سلطنت کہتی تھی۔ وہ بھی تیرا خون مانگتی ہے لیکن دشمنی سے نہیں محبت سے وہ تیری محبت اور وفاداری کا امتحان لیتی ہے۔

کی ذی روح حقیقتوں میں کتنا فعل ہے؟

نصرانی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ عورتوں میں روح نہیں۔ لیکن اے مقدس نصرانی! پیغمبر عائشہ کے لئے بتا! کیا تیرا یہ اعتقاد ہے کہ مسلمانوں میں روح نہیں؟ ہاں روح ہے لیکن تو نے ان کو بے جان کر دیا۔ کیا تجھ کو شریعت کا یہ حکم یاد نہ رہا کہ "تو خون مت کر"۔

مسٹر جیمس مسٹن کی سرکاری اطلاع کہتی ہے کہ "معاملہ انہدام مسجد کے لئے مسلمانان کانپور میں کوئی جوش نہیں، صرف بیرونی مسلمانوں کو جوش ہے" یہ واقعہ قتل عام سے پہلے کبھی یہ غور ہوا کہ اگر یہ سچ تھا تو مسلح سپاہی وقت انہدام مسجد کو کیوں گھیرے تھے؟ سنگینوں اور بندوقوں کے ہیبت ناک نظاروں سے کن کن کو ڈرایا جا رہا تھا؟ اور اب تو حکومت صوبہ متحدہ کو خود نظر آ رہا ہوگا کہ لوازم تدبر و سیاست سے اس کا ذخیرہ کس قدر تہی تھا۔

مسٹر جیمس مسٹن کی سرکاری اطلاع کی شہادت ہے کہ مسلمانان کانپور کا جوش جرائد اسلامیہ کی برافروختگی اور طعن و تشنیع و ملامت کا نتیجہ ہے۔ لیکن وہ کون تھا جس نے مسلمانوں کو کہا تھا کہ ان کی غیرت و حمیت کا جولانگاہ صرف قلم کا میدان ہے؟ شہنشاہی انگلستان کی یہ سرکاری زبان کا مزا۔

مسٹر جیمس مسٹن نے قصداً مسلمانوں کو چھیڑا اور ان کے اس جوش دینی اور دلولہ اسلامی کو جھوٹا کہا جو ۱۳۰۰ برس سے جھوٹا نہ ہوا تھا۔ انھوں نے ان زیر خاک انگاروں کو راکھ کا ڈھیر سمجھا جو تیرہ سو برس سے اسی طرح روشن رہے۔ سر جیمس مسٹن کے یقین کے لئے دلیل چاہیئے تھی، فرزندان اسلام بڑھے اور انھوں نے

تک اپنی بندوقوں سے اڑا اڑا کر گولیوں کی ایک چادر ہوا میں پھیلا دیتی ہے! پردہ
جب چاک ہو جاتا ہے میدان میں خاک و خون میں تڑپتی ہوئی لاشیں نظر آتی ہیں۔
جن میں معصوم جانیں بھی ہیں جو انسوس دم توڑ چکیں۔

گورنمنٹ پریس کا فرشتۂ غیب ہم کو اطلاع دیتا ہے کہ میدان میں ۱۳ لاشیں
تھیں، پھر بتاتا ہے ۱۸ تھیں، عقیدت مند دل اس کو تسلیم کرتا ہے لیکن عقل و حجت
طلب کو کیوں کر سمجھائیں کہ ایک تنگ میدان میں ۱۵ ہزار آدمیوں کا مجمع ہے۔ پولیس
بے تحاشا دس منٹ تک بے پروائی سے ان پر گولیاں برساتی ہے، ہر ایک گولی ایک دو
گز کے فاصلے تک پھیلتی ہے اور صرف ۱۸ لاشیں ان کے صدمے سے گر پڑتی ہیں۔
مسلمان اپنی روئیں تنی کا دعویٰ کرتے ہیں، ان کو مسرور ہونا چاہیئے کہ گورنمنٹ پریس
بھی ان کے اس اعجاز کو تسلیم کرتا ہے۔

حکومت قانون کے ماتحت ہے، لیکن افسوس ہم زبان کے ماتحت ہیں، ہم پر
گورنمنٹ کا قانون حکومت نہیں کرتا، ہم پر حکام کی زبان حکومت کرتی ہے۔ ایک ضعیف
کمزور مجمع جس کے ہاتھ میں کوئی آلہ ضرر نہیں، جو کسی انسان کا محترم خون نہیں گراتا، جو
کسی جائداد و عزت پر حملہ نہیں کرتا، صرف ایک جنبش لب کے لئے آغشتۂ سنگ و خون ہو جاتا ہے
بے شبہہ وہ قانون کی مخالفت کرتا تھا، لیکن اس کی تادیب کے لئے عدالت کے
کمرے اور قید خانوں کی کوٹھریاں تھیں، سنگینوں کی نوکیں اور بندوقوں کی گولیاں نہ
تھیں، برٹش مورخ بتا سکتا ہے کہ برٹش اور مانچسٹر کے کتنے ہنگاموں آتش بار
ہتھیاروں سے کام لیا گیا۔ جب ہم جانتے ہیں کہ وہ ہم کو حوالہ دے گا کہ برٹش بادشاہ کا پیدا
ہونے کتنی مسافت ہے، لیکن اسے معصوم مورخ! برائے خدا ہمیں بتا کہ برٹش مدرکا پیدا

برسی منائیں گے۔ ہم ان کا مرثیہ پڑھیں گے۔ ہم ان کی مظلومی و بیکسی کو ہر وقت یاد رکھیں گے۔ ہم ان کے جوش حمایت دینی و ملی کو سراہیں گے۔ ہم آئندہ سے ۳ اگست کی صبح کو ۱۰ محرم کی دوپہر سمجھیں گے۔ کہ یہ ہماری مظلومیت کی پہلی قسط تھی۔

۳ اگست کی صبح کو ہز آنر لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ اسپیشل ٹرین سے کانپور پہنچ کر قتل گاہ تشریف لائے، جہاں انھوں نے دیکھا ہوگا کہ صرف انسانی ضد اور غلط کاری نے جو گورنمنٹ کے منشا قانونی کے بالکل خلاف تھی، اسی دیوار کے نیچے جہاں چند روز پہلے تیشوں نے ایک معبد اسلام کی بے حرمتی کی تھی، پرستاران دین حنیف ایک ایک اینٹ کو اپنے خون کا سرخ کفن پہنا رہے تھے۔ کہ اس کی ہر اینٹ دین توحید کی ایک سرگذشت تھی۔ انھوں نے اپنے گرم خون کے چھینٹے دیے کہ ان بے جان لاشوں میں حرکت پیدا ہو۔ حرکت پیدا ہوئی اور اس نے تمام ہندوستان کو لرزا دیا۔

ہندوستان لرزتا ہے، کون ہے جو اس کو تھامے؟ ہندوستان مضطرب ہے، کون ہے جو اس کو تسکین دے؟ ہندوستان وقف فریاد ہے، کون ہے جو اس کی فریاد رسی کو آمادہ ہو؟

مقتولین کانپور! تم پر نماز نہیں پڑھی گئی کہ تم مغفور تھے، ہم گنہگار تمھاری مغفرت کی دعا مانگتے ہیں لیکن سنا ہے کہ تم کو کفن نہ ملا، گولیوں اور بندوقوں کے نطع و لحد کے بعد تمھارے جسم اسپتال کی قینچیوں اور چھریوں کے کام آئیں گے۔ غزوۂ بدر میدان میں شہدائے اسلام کی لاشیں فرشتوں نے اٹھائی تھیں۔ ہم آج یقین رکھتے ہیں کہ خدا [illegible] کے لیے اگر پولیس نے تمھاری لاشیں دریا میں پھینکیں اور زمین میں نہیں دفن کیں تو یقیناً تمھاری لاشوں کو فرشتوں نے اٹھا لیا کہ رضوان

مشتعل عام میں جاکر جسمانی پردہ جو فرمانروائے صوبہ کے سامنے حائل تھا الٹ دیا اور
دنیا کو نظر آگیا کہ درحقیقت اس پردہ کے پیچھے سرخ انگارے تھے جو خود دوسروں کو
نہ پھونک سکے پر خود کو پھونک دیا

سر جیمس مسٹن اب کیا چاہتے ہیں؟ کیا دعوائے سابق کے یقین کے لئے کسی
اور دلیل کے طالب ہیں۔ اگر حقیقت میں ان کی طلب صادق ہے اور ان کی کوشش
کامل ہے تو ہم بتاتے ہیں کہ ان آہنی زنجیروں میں بھی آگ ہے جو اسیران مدافعت
ملی کے ہاتھوں اور گردنوں میں ہیں۔ انھیں خبردار رہنا چاہیئے۔ کہ زنجیروں کی
آہنی جسمانیت دوسری آہنی جسمانیت سے ٹکرا کر شعلہ نہ پیدا کرے۔

صوبہ متحدہ کا طرز حکومت اسی وقت ایک خونین منظر کا اشارہ کر رہا تھا۔ جب
اس کا فرمانروا ایک طرف اسٹریچی ہال (علی گڑھ) میں اور دوسری طرف مقامی دربار
(گورکھپور) میں ایک اسپیکر کی حیثیت سے نمودار ہوا تھا۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ "بزور
اس جوش کو فرو کروں گا۔" آخر مسٹر راگرٹ کو اس وقت جب کہ وہ بریلی میں تھا ایک
مسلمان ریاست (رامپور) اس کا خیر مقدم کر رہی تھی اسی نے بزور اس جوش کو فرو کر دیا۔

ہمیں اس کا خوف نہیں کہ مسلمان ایک مسجد کے اعادۂ حرمت کی کوشش
میں مقتول و مجروح ہوئے کہ یہ ان کی خصوصیت ملی ہے۔ ایک ہزار تین سو برس ہوئے
کہ مسجد خلیل کے بقائے حرمت کے لئے سر بکف ہیں، لیکن اس کا خوف ہے کہ حکومت
متحدہ جن غیر قانونی گولیوں سے اپنی وفادار رعایا کو مجروح کر رہی تھی، اس سے وہ خود
تو مجروح نہیں ہو گئی؟

شہدائے کانپور کی یاد ہمارے دلوں میں ہر وقت تازہ رہے گی۔ ہم ان کی

تربیت عسکریہ اور قرآن حکیم

انسانیت نہایت سرکش اور متمرد ہے، اس نے بارہا حقوقِ الٰہی میں دست اندازی کی ہے، اس کی عظمت و جبروت کے سراپردۂ جلال کو چاک چاک کرنا چاہا ہے، اس کے دامنِ توحید پہ چنگل مارا ہے، اور پتھروں بلکہ کنکریوں تک کو اس کا شریک بنا دیا ہے۔

اس نے خدائی پاکی اور قدوسیت کو بھی اپنے انسانی جذبات کے ساتھ ملوث کرنا چاہا اور اس کے صالح بندوں کو اس کا بیٹا بنا دیا سبحانہ وتعالیٰ عما یقولون علواً کبیراً۔

اس نے کبھی کبھی غرور و تکبر کے گھمنڈ میں آکر خود اپنا نسب نامہ بھی خدا کے ساتھ جوڑ دیا ہے، اور اس طرح اپنے خاندان کو تمام دنیا سے اونچا کرنا چاہا ہے تعالی اللہ عما یشرکون۔

الٹی الٹ کا منتظر تھا۔

مجروحین کانپور! تم نے گولیاں کھائی ہیں - نیزوں سے تمہارے سینوں میں سوراخ کیا گیا ہے۔ تمہاری آنکھوں میں سنگینیں بھونکی گئی ہیں۔ تمہارے ایک ایک عضو کو زخموں سے چور کیا گیا ہے۔ تمھیں یاد ہوگا کہ فرات کے کنارے بھی اسلام کا ایک قافلہ اسی طرح لٹا تھا جس کے بعد بنو امیہ کی تاریخ کا ورق الٹ گیا۔

معصوم بچو! اور ریاض اسلام کے نو دمیدہ غنچو! تمھیں کس نے مرتبہ دیا، جس سفّاک کے الفاظ طعن نے تمھیں بے گناہ آشنائے جرم دلوں کو مضطرب کر دیا تم بڑھے کہ اپنے خون سے اس الزام کی تکذیب کر دو۔ اے طائران قدس! اڑ جاؤ کہ عرش کی سبز قندیلیں تمہاری منتظر ہیں۔

اخبارات کے سیاہ حرفوں میں ہمارے لئے تنبیہ و عبرت نہ تھی قدرت نے خون کی سرخ تحریروں میں نامۂ عبرت و دستور تنبیہ بھیجی۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے اس کو پڑھا اور اس سے تنبیہ و عبرت حاصل کی۔

کانپور کا واقعہ کانپور کا نہیں رہا - بلکہ دنیائے اسلام کا واقعہ ہے، مسلمانانِ عالم نے پیرس سے ہمارے پاس اپنے مصائب و آلام کی آغشتہ خون اطلاعات کا ہدیہ بھیجا تھا۔ ہم شرمندہ تھے کہ ہمارے پاس ان کے تحفہ کے لئے جو سامان تھا اس میں خون کے قطرے نہ تھے - اب شرمندہ نہیں۔ اے مسلمانانِ عالم! ہمارے بہتے ہوئے خون کی چھلکتی رگوں اور تڑپتی ہوئی لاشوں کا ہدیہ قبول کرو۔

پسینے اور گردنوں سے بہے ہوئے خون سے اپنی تشنگیٔ ظلم کو تسکین دی، اور اپنی قوم و ملک کو اپنی قومی سیادت و عظمت کے لئے ایک آلۂ بے جان بنا لیا، تاکہ اپنی قدرتی حرکت کو چھوڑ کر صرف انہی کے اشاروں پہ حرکت کریں، تو اس وقت خدا نے بھی اپنے شکنجۂ عذاب کو پہلے سے زیادہ سخت کیا، اور جو سیاست اہلی پہلے سے قائم تھی، اس کا رنگ بالکل بدل گیا۔ پہلے سیاست ربانی کا منصب صرف آسمان و زمین اور ابر و دریا کو حاصل تھا، جن کی عذاب کی چکی چند لمحوں کے اندر قوم کی قوم کو پیس ڈالتی تھی، مگر اب یہ خدمت خود انسان ہی کو بلکہ صرف انسان کے ہاتھ کی دس انگلیوں کو سپرد کی گئی۔ انسان جب تک خدا کے حقوق کو پامال کر رہا تھا خدا اپنی عظیم الشان مخلوقات کے ذریعہ سے اس کو عذاب دیتا تھا۔ اب خود انسان کے حقوق روندے جا رہے تھے، اس لئے خدا نے بھی انسانیت کی عزت و احترام کو قائم رکھنے کے لئے خود انسان ہی کو کھڑا کر دیا!

زمانہ وحشت میں انسان نے کتنے انسانوں کے حقوق پامال کئے ہوں گے؟ کتنے انسانوں کو قتل کر دیا گیا ہوگا؟ کتنے بچے ذبح کر دیئے گئے ہوں گے؟ کتنی عورتوں کے سر سے چادر عصمت اتاری گئی ہوگی؟ ان حقوق کے تحفظ کے لئے تلواریں بھی چمکی ہوں گی، نیزوں نے بھی اپنی روانی دکھائی ہوگی، کمانوں کی چرچراہٹ کی آواز سے بھی وحشت کدۂ عالم گونج اٹھا ہوگا، لیکن تاریخ نے ان واقعات کو یاد نہیں رکھا وہ اس وقت موجود نہ تھی، اسی لئے وہ بھی ان قوموں کے ساتھ جنگل کے تاریک گوشوں اور پہاڑوں کے تنگ غاروں میں گم ہو گئی۔ البتہ زمانہ تمدن کی تاریخ نے اس قسم کے سینکڑوں واقعات کو اب تک از بر کیا ہے اور اس

اس نے خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبروں کو ساحر، مجنون، پاگل اور دیوانہ کہا ہے، ان کو طرح طرح کی اذیتیں دی ہیں، ان کے ساتھ ہر موقع پر گستاخی کی ہے بلکہ کبھی کبھی خدا کے ان صالح بندوں کو قتل بھی کر دیا ہے۔

لیکن اس سرکش انسان کا خون اس قدر گراں قیمت اور بیش بہا ہے کہ اس تمرد و طغیان پر بھی خدا نے اس کی حرمت کو قائم رکھا۔ لیکن جب سرکشی و عصیان نے بہت زیادہ سر اٹھایا، اور خدا کے دائرہ عفو کرم سے آگے بڑھ گئی، تو قانون تعذیب الہٰی کو بھی حرکت ہوئی۔ اور خدا نے ظالم قوموں پر اپنی عظیم الشان مخلوقات کو مسلط کر دیا۔ انھوں نے اس کو بد اعمالیوں کی پوری پوری سزا دی۔ ثمود کو زمین نے پیس کر غبار بنا دیا۔ عاد کو ہوا کے جھونکے خس و خاشاک کی طرح اڑا لے گئے۔ قوم نوح کو طوفان کا ریلا تنکے کی طرح بہا لے گیا! وکذٰلک اخذ ربک ... آلخ

حقوق العباد:۔

لیکن بایں ہمہ خدا نے اپنے حقوق کی حفاظت و احترام کے لئے کبھی بھی ایک قطرہ خون نہیں بہایا۔ خدا نے دنیا کی بڑی بڑی متمرد قوموں کو مٹا دیا، ان کی نسل فنا کر دی، ان کی یادگاروں کو برباد کر دیا، لیکن وہ جس سرزمین پر آباد تھے، اس کے دامن پر خون کا ایک دھبہ بھی نظر نہ آیا۔

البتہ جب انسان نے حقوق الہٰی کے حدود سے بھی آگے قدم بڑھایا اور خود اپنے بھائیوں کے فطری حقوق کو پامال کرنا چاہا، ان کے ملک چھین لئے، ان کی آزادی و خود مختاری سلب کر لی، ان کے بچوں کی آزادانہ نشو و نما روک دی۔ ان کی زمینوں پر اپنے عیش و نشاط کے محل تعمیر کئے، ان کے جسم سے نکلے ہوئے

ہے، لیکن مذہبی تاریخ واقعات میں تسلسل، ونظام وترتیب نہیں ڈھونڈتی۔ وہ دنیا کو محض عبرت کا افسانہ سناتی ہے۔ اس لئے وہ صرف ایک اہم اور کثیر النتائج واقعہ کا انتخاب کر لیتی ہے، جو تمام دنیا کے لئے مجموعۂ عبرت ہوتا ہے، اور اس کو بار بار دنیا کے آگے پیش کرتی رہتی ہے۔ اس اصول کی بناء پر اس نے ہم کو صرف فرعون کے مظالم کی داستان سنائی ہے، جس کا انتہائی ظلم وعداون یہ تھا کہ وہ اپنی اجنبی رعایا کے اندر پھوٹ اور نااتفاقی ڈال کر حکومت کرتا تھا، اور ایک گروہ کو ضعیف اور دوسرے کو قوی رکھتا تھا۔

ان فرعون علا فی الارض	فرعون نے خدا کی زمین میں سر اٹھایا، اور اس
وجعل اھلھا شیعا	کے رہنے والوں میں پھوٹ ڈال کر ان کو گروہ
یستضعف طائفۃ	در گروہ بنا دیا۔ وہ ان میں سے ایک جماعت کو کمزور
منھم (۲۸ : ۳)	رکھتا اور ابھرنے نہ دیتا۔

مذہبی حکومتوں کے سوا ظلم ہر دنیوی سلطنت کا مایہ خمیر ہے، اور باوجود مختلف قسم کے مظالم کے وہ اپنی زندگی کے وہ دن پورے کر لیتی ہیں جو خدا نے ان کے لئے مقرر کر دئے ہیں۔ لیکن جب کوئی سلطنت ظلم کو اس انتہا درجہ تک پہنچا دیتی ہے کہ انسانی حقوق کا کوئی ٹھکانا نہیں رہتا تو یہ اس کی زندگی کا آخری دن ہوتا ہے۔ اس وقت اس کا تاج وتخت الٹ دیا جاتا ہے اور وہ صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دی جاتی ہے۔

آج بھی ہم دیکھ رہے ہیں کہ خدا کا یہ قانون کس طرح کام کر رہا ہے؟

آموختہ کو یاد کرنے میں سب سے زیادہ زبانِ تیغ نے مدد دی ہے۔ خون کے دھبوں نے ان کے نقوش رنگین کو کبھی مٹنے نہ دیا۔

DIVIDE AND RULE

تربیت عسکری کے لئے پہلی چیز ایک متحدہ قومیت کا پیدا ہونا ہے۔ محض انسانوں کی ایک بھیڑ سے منظم فوج نہیں بن سکتی۔ جب تک کہ قومیت کی روح ایک متحد جماعت نہ پیدا کر دے۔ باہمی اتفاق و اتحاد کی زنجیریں سب کے پاؤں میں ہوں، کسی ایک مقصد کے عشق اور ایک حکم کی اطاعت میں سب کے سب ایک ہو جائیں یہی وجہ ہے کہ جو حکومتیں اپنے جبر و استبداد کے قائم کرنے کے لئے کسی قوم کے سپاہیانہ جذبات کو فنا کرنا چاہتی ہیں، وہ سب سے پہلے سیاسی فریب و وسائل کے ذریعہ اس میں پھوٹ، نفاق، بغض و کینہ اور باہمی انتقام کے جذبات خفیتہ پیدا کر کے ان کی جمعیت کو توڑ دیتی ہیں، اور اس طرح رفتہ رفتہ ان کی قومیت فنا ہو جاتی ہے۔

لیکن اس خدع و فریب کی ضرورت اسی وقت ہوتی ہے، جب قوم میں کچھ لوگ بیدار دماغ، متحرک اعصاب اور مضطرب دل رکھتے ہوں، اور سیاست کی چھپی ہوئی چالوں کے زہر آلود اثر سے متاثر ہوتے رہتے ہوں۔ لیکن جب کوئی قوم دل و دماغ کھو کر اپنے سرچشمہ احساس کو فنا کر دیتی ہے، تو پھر ان فریب کاریوں کی ضرورت ہی نہیں ہوتی، بلکہ سر بازار تلوار سے اس کے نقش وجود کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا جاتا ہے۔

دنیا کی ملکی تاریخیں اس قسم کی بہت سی مٹی ہوئی قوموں کو نمایاں کر سکتی

يحذرون ۔ (۶:۲۸) وہی ان کے سامنے لائیں گے ۔

انقلاب قوت وضعف :۔

یہ تو سلطنت فرعونی کے انقلاب کی سرگذشت تھی، لیکن غور کرو کہ اس آیت کریمہ کے اندر قرآن حکیم نے کس طرح اپنے ایک قانون الٰہی کی خبر دے دی ہے؟ وہ بتلاتا ہے کہ دنیا قوت کے جاہ وجلال کی نمائش گاہ ہے، اور کمزوروں کی ہلاکت کا مقتل ہے۔ طاقتور قومیں کمزوروں کو اپنا غلام ومحکوم بناتی ہیں، ان میں پھوٹ اور اختلاف ڈالتی ہیں، ان کے مختلف فرقوں اور مختلف گروہوں کو باہم ملنے نہیں دیتیں، کیونکہ اگر وہ مل کر ایک ہو جائیں تو پھر کمزور نہ رہیں اور اتفاق ویگانگت کی طاقت اعلیٰ ظالموں کا تخت وتاج الٹ دے۔ یہی حال مصر میں بنو اسرائیل کا تھا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی دنیا کا ایک مستثنیٰ قانون بھی ہے، اور خدا کے زبردست گاہ گاہ چمک جانے والی حرکت بھی ہوتی ہے۔ جب ظلم اور طاقت کے شیطان کا غرور حد سے بڑھ جاتا ہے تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ دنیا طاقت والوں کی جگہ کمزوروں کا گھر بنا جاتی ہے، اور وہی زمین جو کمزوروں کے لئے قتل گاہ تھی، طاقت والوں کی تباہی وہلاکت کا تماشا گاہ بن جاتی ہے۔ بس اس دن چھوٹے بڑے کئے جاتے ہیں اور بڑوں کو چھوٹا بنا دیا جاتا ہے۔ وہ کہ کمزور کر دیئے گئے تھے، وہ کہ بیکس اور بے نوا تھے، وہ کہ صرف رو رہے، ماتم کرنے، بے بسی کی چیخیں مارنے، اور لٹنے لٹانے کے لئے تھے، وقت آتا ہے کہ احسان الٰہی کے سزاوار ٹھہرتے ہیں، اور کمزوروں کی جگہ طاقت کے لئے، بیکسی کی جگہ فرمانروائی

ظلم کی موت ہی سے عدل پیدا ہوتا ہے :-

لیکن دنیا پر یکے بعد دیگرے متضاد قوتوں نے حکومت کی ہے، رات کے جانے کے بعد ہمیشہ دن جلوہ گر ہوا ہے، تاریکی کے بعد ہمیشہ روشنی چمکی ہے، سیاہی کے بعد ہمیشہ سفیدی نے ظہور کیا ہے، یہی حال حکومتوں اور سلطنتوں کا بھی ہے، جب ایک ظالم حکومت مٹتی ہے تو اس کی جگہ اسی وقت ایک عادل سلطنت قائم ہو جاتی ہے۔ ظلم کا جانا ہی عدل کے ظہور کا پیام ہے، اور رات اگر ختم ہو گئی ہے تو اس کے یہی معنی ہیں کہ دن آ گیا۔

جب جابرانہ قوتوں کی قوت فنا ہو جاتی ہے، تو ایک عادلانہ نظام قائم ہو جاتا ہے۔ فرعون کی جابرانہ سلطنت کا زوال ایک دوسری قوم کی عادلانہ حکومت کا مقدمہ تھا، اس لئے خدا نے فرعونیوں کی ہلاکت کے ساتھ ہی عدل الٰہی کے قیام کا مژدہ سنا دیا :-

ونرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلھم ائمۃ ونجعلھم الوارثین ونمکن لھم فی الارض، ونری فرعون وھامان وجنودھما منھم ما کانوا

اور ہم اپنے دائمی قانون کی بنا پر چاہتے ہیں کہ جو لوگ ہماری زمین میں کمزور بنا کر ایک مدت تک رکھے گئے ہیں، ان پر احسان کریں، اور ان کو دنیا کی پیشوائی عطا فرمائیں، بڑی بڑی طاقت ور قوموں کے تاج و تخت کے وہی وارث ہوں، اور ان کی بادشاہت زمین پر قائم ہو جائے۔ فرعون اور ہامان اور ان کی حکمران قوم کو انکی طرف سے جس چیز کا کھٹکا تھا اور جس کے لئے وہ انھیں کمزور رکھتے تھے

ان ارضعیه فاذا خفت علیه فالقیه فی الیم ولا تخافی ولا تحزنی انا رادوه الیک وجاعلوه من المرسلین

(۲۸:۶)

بات ڈال دی کہ اس کو دودھ پلائے، اور اگر فرعون کے ظلم کی وجہ سے اس کی جان کا خوف ہو تو دریا میں ڈال دے۔ اور کسی قسم کا خوف یا غم نہ کرے، ہم بچہ اس کی گود میں اسکے لخت جگر کو واپس کردیں گے اور اسکو اپنا پیغمبر بنائیں گے۔

حضرت موسیٰ کی والدہ نے اپنے لخت جگر کو دریا کی لہروں کی آغوش میں ڈال دیا۔ لیکن نیل کی لہریں اس امانت مقدس کو اور کہیں نہیں لے گئیں، اسی کے محل تک بحفاظت پہنچا دیا جس کے سرغرور کو کچلنے کے لئے ایک دن یہ شیرخوار بچہ اٹھنے والا تھا۔ فرعون کی عورتوں کو ان پر مہربان کر دیا۔ انھوں نے اپنے بچوں کی طرح اس شاہی محل کے اندر پرورش کی، اور ان کی والدہ ہی ان کی دایہ قرار پائیں۔ اس میں اللہ کی بڑی مصلحت یہ تھی کہ حضرت موسیٰ کی پرورش شاہی محل میں ہوگی تو بادشاہوں کے جاہ و جلال باطل کا رعب ان کے دل سے نکل جائے گا، اور بچپن ہی سے شاہانہ زندگی، سیاست و ملک داری کے طریقے اور ظالمانہ حکومتوں کے تمام اسرار و خفایا ان پر منکشف ہو جائیں گے۔

فالتقطه آل فرعون لیکون لهم عدوا وحزنا ان فرعون وهامان وجنودهما کانوا خاطئین

(۲۸:۷)

پھر اس کو آل فرعون نے دریا سے نکال لیا، اور اس بچے کی پرورش کیا تاکہ آگے چل کر وہ ان کا دشمن اور سرمایہ رنج و غم بنے۔ بے شک فرعون ہامان اور ان کا لشکر غلطی پر تھا، جبکہ اپنے دشمن کو اپنے گھر کے اندر پال رہا تھا۔

کے لیے، رونے کی جگہ خوشیوں کے لیے، ماتم کی جگہ عیش و کامرانی کے لیے، اور لٹنے کی جگہ لوٹنے کے لیے، تمام عالم میں نمایاں ہو جاتے ہیں۔ قوت فرعونی کی جگہ موسوی کی تلوار آن کی آن میں دنیا کو پلٹ دیتی ہے، اور صدیوں کی گری ہوئی قومیں پھر جاہ و جلال ربانی کے ظہور و قیام کے لیے دنیا کی وارث اور خلیفہ بنا دی جاتی ہیں۔

تربیت عسکری:۔

لیکن جس طرح تلوار کی آخری حرکت کسی سلطنت کی شاہ رگ کاٹ دیتی ہے، اسی طرح اس کی پہلی جنبش نظام حکومت کو قائم بھی کر دیتی ہے۔ حکومت سیاست کا سرچشمہ ہے، اور سیاست کی پیاس ہمیشہ تلوار ہی کے پانی سے بجھی ہے۔ خدا تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے تاج و تخت الٹنے اور بنو اسرائیل کی حکومت قائم کرنے کے لیے ایک تیغ برہنہ کی صورت میں نمایاں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے دیکھو کہ کس طرح ان کو بچپن ہی سے میدان جنگ کے شدائد و مصائب برداشت کرنے کا خوگر بنایا اور طرح طرح کی آزمائشوں میں ڈال دیا۔ ابھی انھوں نے دنیا میں پہلا ہی قدم رکھا تھا کہ ماں کی آغوش محبت سے جدا ہو گئے۔ جس آغوش کی محبت سے زمین پر رینگنے والے کیڑے بھی محروم نہیں رہتے اللہ تعالیٰ کی معلمانہ مشیت نے اپنے رسول اولوالعزم کو اس سے محروم کر دیا۔ دریائے نیل کی طوفان خیز موجوں کی آغوش میں انھیں ڈال دیا گیا کہ ایک دن دریا کے طوفان ہی میں سے ان کو اپنی راہ نکالنی تھی۔

و اوحینا الیٰ ام موسیٰ ان   اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی ماں کے دل میں یہ

سواء السبیل (۲۱: ۲۸) راستہ دکھائے گا۔

درسگاہِ مدین :-

خدا نے ان کی رہنمائی کی اور خطِ مستقیم اُن کو اپنے ایک صالح بندے کی آغوشِ تربیت میں ڈال دیا۔ وہاں انہوں نے کامل آٹھ سال تک آزادی کی ہوا میں اپنے جذبات حقہ و نوازعِ صالح کو نشو و نما دی۔ پھر جب پلٹے تو فرعون کے تاج و تخت الٹنے کے لئے تمام ساز و سامان نصرت سے مسلح تھے۔

وان الق عصاك فلما راٰها تهتز كانها جان ولّٰى مدبرا ولم يعقب. يٰموسٰى اقبل ولا تخف انك من الاٰمنين. اسلك يدك فى جيبك تخرج بيضاء من غير سوء، واضمم اليك جناحك من الرهب فذانك برهانان من ربك الى فرعون وملائه انهم كانوا قوما فٰسقين

(۲۸: ۳۱)

اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنی لاٹھی کو پھینک دو۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے عصا پھینک دیا، لیکن جب دیکھا کہ وہ سانپ کی طرح حرکت کر رہا ہے، تو پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے اور پھر اس طرف رخ نہ کیا۔ ہم نے کہا اے موسیٰ (علیہ السلام) یہاں آگے بڑھو، مطلق خوف نہ کھاؤ، تم محفوظ ہو گئے، پھر ہم نے حکم دیا کہ اپنے ہاتھ کو گریبان میں ڈالو، وہ چمکتا ہوا نکلے گا۔ تمہارے خدا کی طرف سے فرعون اور اس کے ارکان سلطنت کے لئے یہ دو نشانیاں دی گئی ہیں۔

آغاز کار:۔

اس کے بعد آزمائش و ابتلاء کے متعدد موقعے پیش آئے۔ انھوں نے ایک ظالم شخص کو عین حالت ظلم میں قتل کر دیا۔

ودخل المدينة على حين
غفلة من اهلها، فوجد فيها
رجلين يقتتلان: هذا من
شيعته وهذا من عدوه
فاستغاثه الذي من شيعته
على الذي من عدوه فوكزه
موسى فقضى عليه۔ قال
هذا من عمل الشيطان
انه عدو مضل مبين

اور جب کہ تمام لوگ غافل تھے موسیٰ علیہ السلام
شہر میں آئے، اور اس میں دو آدمیوں کو لڑتے
ہوئے دیکھا، ان میں ایک آدمی ان کی قوم کا تھا
اور دوسرا ان کے دشمن کے گروہ کا۔ موسیٰ کو دیکھ کر
ان کی قوم کے آدمی نے دشمن کے ظلم کی فریاد کی،
اور موسیٰ علیہ السلام نے اس کو ایک گھونسا مارا کہ وہ
مر گیا۔ یہ حال دیکھ کر وہ گھبرائے کہ شیطان نے
مجھے مصیبت میں پھنسا دیا۔ بے شک شیطان
گمراہ کن دشمن ہے۔

(۲۸:۱۵)

اب خدا نے ظلم و تشدد اور انسانی عبودیت و غلامی کی سرزمین سے ان کو دور کرنا چاہا، کیونکہ ضرورت تھی کہ وہ کسی آزاد مقام پر رہ کر آنے والے رسالت کے لئے تیار ہو جائیں۔ پس وہ نکلے، اور ایک طرف خدا کی رہنمائی کے سہارے پر چل کھڑے ہوئے:۔

فلما توجه تلقاء مدين
قال عسى ربي ان يهديني

جب موسیٰ مصر سے نکل کر مدین کی طرف
روانہ ہوئے، تو کہا کہ خدا مجھ کو ضرور سیدھا

کہ اس تیار کردہ فوج کی حرکت شروع ہو جائے۔ پس پہلی منزل یہ ہے کہ اب فرعونی گورنمنٹ کے ساز و سامان اور احکام و قوانین کی بالکل پروا نہ کرو۔ وہ بنو اسرائیل کو اپنی غلامی سے نکلنے نہیں دیتی، مگر تم کو اپنے ساتھ لے کر راتوں رات نکل کھڑے ہو۔ تمہارا تعاقب کیا جائے گا، لیکن عذابِ الٰہیؒ بھی اس کے تعاقب سے غفلت نہیں کرے گا:۔

فاسر بعبادی لیلا انکم	میرے بندوں کو لے کر راتوں رات نکل جاؤ،
متبعون (۴۴:۲۲)	کیونکہ تمہارا تعاقب کیا جائے گا۔

انھوں نے حکم الٰہی کی تعمیل کی، اور اس طرح فوج کے لئے جس اجتماع و انضمام کی ضرورت ہوتی ہے اس کا قوام تیار ہو گیا۔

رُوحِ عسکری:۔

لیکن فوج صرف آدمیوں کی اُس صف ہی کا نام نہیں ہے جو میدانِ جنگ میں دیوار کی طرح کھڑی کر دی جاتی ہے، بلکہ جس طرح دنیا کی ہر حقیقت مادہ و قوت سے مرکب ہے۔ اسی طرح فوج بھی جسم و روح کے مجموعہ کا نام ہے۔ یہ روح تلواروں کے چمکتے ہوئے جوہروں میں نہیں مل سکتی، اس کا آشیانہ شہسواروں کے خود میں نہیں ہے، وہ حلقہ دار زرہ کے جال میں مرغِ رشتہ بپا کی طرح گرفتار نہیں ہے، اُس نے ان تمام قیود سے آزاد ہو کر صرف سپاہیوں کے دل ہی کو اپنا گھر بنایا ہے، اسی گوشے میں اس کی معجزانہ طاقت کی کارفرمائیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ فوج کی تعداد کی کمی بیشی سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا، ایک سو اور ایک ہزار کے اختلاف سے اس کی حقیقت نہیں بدل جاتی، سامانِ جنگ کے عدم وجود

سپہ سالارِ جنگ :-

فوج کی تنظیم و ترتیب کے لئے جس سپہ سالار کی ضرورت تھی وہ تمام آلات حرب سے مسلح ہو گیا، لیکن وہ جن لوگوں سے اپنی فوج کو مرتب کرنا چاہتا تھا وہ خود گرفتار زندان مصیبت تھے، اس لئے اس نے اپنا پہلا مطالبہ جو فرعونی گورنمنٹ سے کیا، وہ اسی فوج کی رہائی کا مطالبہ تھا۔

ان ادوا الی عباد اللّٰہ، انی	خدا کے ان بندوں کو میرے حوالے کر دو میں تمہارے
لکم رسول امین (۱۷: ۴۴)	پاس ایک امانت دار پیغمبر بن کے آیا ہوں

داخلی تبلیغ :-

لیکن فرعون نے جیسا کہ تمام ظالم بادشاہوں کا طریقہ ہے، ان کے اس الہی مطالبہ کو رد کر دیا۔ پس ضرور ہوا کہ اب کچھ دنوں تک مصر ہی میں بنی اسرائیل کی تربیت و تعلیم کا انتظام کیا جائے اور صدیوں کی محکومی و غلامی نے جس درجہ ان کے فوجی قویٰ کو معطل کر دیا ہے، اسی درجہ کی قوی و موثر تعلیم کے ذریعہ ان میں حریت و استقلال کے عزائم پیدا کئے جائیں۔

پس حکم الہی کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی دعوت کی داخلی تبلیغ میں مشغول ہو گئے اور بنو اسرائیل کو آنے والے وقت کے لئے تیار کرنا شروع کر دیا۔ اس تیاری کا طریقہ اور اس کے اصول جو قرآن حکیم نے بتلاتے ہیں، ہم کسی دوسری صحبت میں ان کی طرف متوجہ ہوں گے۔

پہلی فوجی نمائش :-

جب ایک اچھی مدت اس پہ گذر گئی تو حکم الہی ہوا کہ اب وقت آگیا ہے

مومنین بالغیب کا ایک چھوٹا سا گروہ ضرور پیدا کر دیا جس نے عزیمت صادقہ کی روح سے معمور ہو کر فرعون کو للکارا تھا:۔

فاقض ما انت قاض، انما تقضی ھذہ الحیوٰۃ الدنیا (۲۰:۷۵)	جو حکم چاہو ہمارے لئے دو، تمہاری حکومت زیادہ سے زیادہ اس دنیوی زندگی ہی کا فیصلہ کر سکتی ہے کہ ہمیں قتل کر دے۔ اس سے زیادہ تم اور کیا کر سکتے ہو

لیکن یہ بھی صرف نور ایمان کی ایک جدید روح کی صدا تھی جس نے غلاموں کے ملک میں حریت حقہ کا غلغلہ بلند کر کے ایک نمونہ قائم کر دیا، ورنہ بنو اسرائیل کے حلقے سے اس قسم کی صدائیں بلند نہیں ہو سکتی تھیں۔

جہاد فی سبیل اللہ سے اعراض:۔

پس اس بنا پر بنو اسرائیل کی نوجی تعلیم و تربیت کے لیے وہی قدرتی مرکز موزوں تھا جہاں انسان نے سب سے پہلے آزادی کی ہوا کھائی ہے۔ یعنی آبادیوں اور بستیوں سے الگ کوئی صحرا اور میدان جہاں اور کسی کی حکومت نہ ہو، نہ کسی انسان کا حکم۔ آزاد چڑیوں کے غول ہوں اور خود مختار پرندوں کے جھنڈ، ان کا مشاہدہ فطرت و حقیقی میں رہ کر وہ اپنی گم شدہ حریت کو تلاش کر سکتے تھے جو مصر کی آبادیوں میں کھو گئی تھی۔

لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلے آنے والے جاہ و جلال اور عظمت و بادشاہی کو ان کے جذبہ شجاعت کو تازہ کرنا چاہا:۔

واذقال موسیٰ لقومہ یاقوم اذکروا نعمۃ اللہ	جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا، اے لوگو خدا کی نعمتوں کو دیکھو اس نے تم میں

کو اس میں کوئی دخل نہیں، وہ چاہے تو ایک انسان کے اندر چاک کر اسے ایک ہزار انسانوں پر غالب کر دے:

یاایھا النبی حرض المومنین	اے پیغمبر مسلمانوں کو جہاد کے لئے ابھارو
علی القتال ان یکن منکم	اگر تم میں بیس آدمی بھی صابر ہو گئے تو وہ
عشرون صابرون یغلبوا	دو سو دشمنوں پر غالب آ جائیں گے، اور اگر
مائتین وان یکن منکم مائۃ	تم میں سو آدمی بھی صبر کی طاقت رکھتے ہوں
یغلبوا الفا من الذین کفروا بانہم	گے تو کفار کی ایک ہزار جمعیت پر غلبہ
قوم لا یفقھون (۸:۶۶)	حاصل کریں گے

عزم و استقلال اور صبر و توکل کی طاقت صرف افراد کی کثرت سے پیدا نہیں ہو سکتی، اس کو آزادی کی زندگی ہی پیدا کرتی ہے جو قوائے انسانی کی نشو و نما کی فطری تربیت گاہ ہے۔

لیکن آزادی ایک ایسا جوہر ہے، جو کبھی تو اس قدر ارزاں ہو جاتا ہے کہ ہر ریگستان کے چمکتے ہوئے ذرے میں مل سکتا ہے، اور کبھی اس قدر گراں قیمت ہو جاتا ہے کہ صرف تاج شاہی کے ٹکے ہوئے موتیوں میں اس کی جھلک نظر آتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جس قوم کی تعلیم و تربیت کے لئے خدا کی طرف سے مامور ہوئے تھے، اس کے اندر یہ جوہر یک قلم مفقود ہو گیا تھا۔ فرعون کی غلامی نے اس کے تمام شریفانہ جذبات فنا کر دیئے تھے، اس نے کبھی حکومت کا خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیغمبرانہ دعوت کی طاقت نے

ہی قائم کرسکتا تھا۔ بنو اسرائیل کے دل اس کی حرارت سے خالی تھے۔ دو مخلص مومنوں نے اپنے نورِ ایمان کی حرارت سے ان کے دلوں کو گرمانا چاہا:۔

قال رجلان من الذین یخافون انعم اللہ علیہما ادخلوا علیہم الباب فاذا دخلتموہ فانکم غالبون۔ وعلی اللہ فتوکلوا ان کنتم مومنین۔ (۵:۲۶)

جو لوگ بیت المقدس میں داخل ہونے سے ڈر رہے تھے، انھیں میں سے دو آدمیوں نے جن پر خدا نے نورِ ایمان کے ذریعہ احسان کیا تھا کہا جہاد فی سبیل اللہ سے انکار نہ کرو اور اللہ پر اعتماد کرکے ارضِ مقدس میں داخل ہو جاؤ گے تو تم یقیناً غالب ہوگے۔ اگر تم مسلمان ہو تو خدا پر بھروسہ کرو۔

لیکن اس پر بھی ان کے دلوں میں حرارت پیدا نہ ہوئی، اور انھوں نے صاف جواب دیا:۔

قالوا یٰموسیٰ انا لن ندخلھا ابدا مادامو فیھا، فاذھب انت وربک فقاتلا، انا ھٰھنا قاعدون (۵:۲۷)

ان لوگوں نے کہا اے موسیٰ (علیہ السلام) جب تک وہ طاقتور لوگ اس شہر میں ہیں ہم ہرگز داخل نہیں ہو سکتے۔ تم اپنے خدا کے ساتھ جا کر لڑو، ہم اس جگہ بیٹھ کر تماشا دیکھیں گے۔

چہل سالہ قیامِ صحرا:۔

اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بالکل مایوسی ہو گئی، اور انھوں نے اس بزدل قوم سے علٰحدہ ہونا چاہا:۔

عليكم اذ جعل فيكم انبياء وجعلكم ملوكا وآتاكم ما لم يؤت احدا من العٰلمين۔ يا قوم ادخلوا الارض المقدسة التى كتب الله لكم ولا ترتدوا على ادباركم فتنقلبوا خاسرين (۵:۲۳)

پیغمبر پیدا کئے تھے، اب تم کو بادشاہ بنایا ہے اور وہ عظمت عطا فرماتا ہے جو اب تک کسی کو بھی نہ دی تھی۔ پس عزم اور ہمت کرو، اور ارض مقدس میں داخل ہو جاؤ۔ اُس کی حکومت صرف تمہاری ہی قسمت میں لکھ دی گئی ہے، اور ہرگز بزدلوں کی طرح پیٹھ نہ پھیرو، اس کا نتیجہ بجز ناکامی و محرومی کے کچھ نہ ہوگا۔

لیکن یہ امتحان ایک ایسی قوم کے لئے سود مند ہو سکا جو صدیوں سے غلامی کی لعنت میں گرفتار تھی۔ بنو اسرائیل کی بزدلی نے نہایت مایوسانہ جواب دیا:۔

قالوا یموسیٰ ان فیها قوما جبارین وانا لن ندخلها حتی یخرجوا منها فان یخرجوا منها فانا داخلون۔ (۵:۲۵)

اُن لوگوں نے جواب دیا کہ اے موسیٰ علیہ السلام ارض مقدس میں ایک نہایت ہیبت ناک قوم رہتی ہے۔ ہم اس میں ہرگز داخل نہیں ہو سکتے وہ اپنے ساز و سامان اور طاقت سے ہمیں پیس ڈالیں گے، جب تک کہ وہ ملک سے خود بخود نکل نہ جائیں ہم اس کا رخ نہ کریں گے۔

اس داخلہ سے محض شاہی جاہ و جلال کا منظر دکھانا مقصود نہ تھا بلکہ بنو اسرائیل کی تقدیر کی سوئی عظمت کو خلافت الٰہی کی صورت میں قائم کرنا تھا، اور خلافت الٰہی کے قائم کرنے کے لئے جس قسم کی شجاعت درکار ہوتی ہے، اس کو صرف نورِ ایمان

لطل اور نہ غازی شکری پاشا

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما!

ایک چراغ سے ہزاروں چراغ روشن ہو جاتے ہیں۔ آگ کی ایک چنگاری بڑے بڑے آتش کدوں اور تنوروں کو شعلوں سے بھر دیتی ہے۔ ایک بیج صدہا شاخیں اور ہزاروں پھل پیدا کر دیتا ہے۔ بارانِ رحمت الٰہی کا ایک شاداب دن، پوری فصل کو سرسبز کر دینے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ موتی کا ایک بڑا دانہ، پورے ہار کی عزت بڑھا دیتا ہے۔ ہیرے کا ایک درخشندہ ٹکڑا پورے تاج کے حسن و جمال کے لئے بس کرتا ہے۔ کیوڑے کا ایک درخت پورے باغ کے معطر ہونے کے لئے۔ گلاب کا ایک قیمتی پھول پورے ایوان و منزل کیلئے اور بہ تمثیل سادہ تر، ایک چراغ پورے کمرے کی روشنی کے لئے کافی ہوتا ہے!

یہی حال قوموں اور ملکوں کا ہے۔ قوموں میں جب زندگی آتی ہے تو

قال رب! انی لا املک الا نفسی و اخی، فافرق بیننا وبین القوم الفسقین (۵:۲۸)

حضرت موسیٰ نے کہا: خداوندا! میں صرف اپنے وجود پر اور اپنے بھائی ہارون پر ہی اختیار رکھتا ہوں اپنی قوم کی بزدلی اور روحانی موت کو کیا کروں، اب آپ مجھ میں اور اس بدکار قوم میں علیحدگی کر دے

لیکن حکم الٰہی ہوا کہ اے موسیٰ! تم مایوسی کے لئے پیدا نہیں کئے گئے ہو، تمہاری پیغمبرانہ استقامت کی طاقت کو ان مشکلوں کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ بنی اسرائیل کو مدتوں کی غلامی نے جہاد فی سبیل اللہ کی مقدس راہ سے نا آشنا کر دیا ہے، وہ چھوٹی چھوٹی راحتوں کے عاشق ہیں، بڑے مقصد کی راہ میں مصیبت اٹھانے سے جی چراتے ہیں۔ غلامی کی زندگی کا لازمی نتیجہ ہے۔ پس اس سے نہ گھبراؤ اور انہیں یہاں سے نکال کر کسی آزاد و بے قید صحرا میں جا بساؤ، وہاں کی خالص اور فطری آب و ہوا میں ایک زمانہ بسر کریں۔ عہد غلامی کی پرورش یافتہ نسل مٹ جائے ایک نئی مستعد نسل پیدا ہو، پھر وہ راہ جہاد کی مشکلات کو برداشت کر سکے گی۔

قال: فانها محرمة علیهم اربعین سنة یتیهون فی الارض فلا تاس علی القوم الفسقین (۵:۲۹)

خدا نے کہا: بیت المقدس کا داخلہ ان کیلئے چالیس سال تک حرام ہو گیا۔ اب اسی سرزمین میں وہ سرگرداں رہیں گے۔ حصول عظمت میں یہ چہل سالہ تاخیر انہی کی بزدلی کا نتیجہ ہے۔ پس ایسے لوگوں کی محرومی پر تمہیں افسوس نہیں کرنا چاہیئے۔
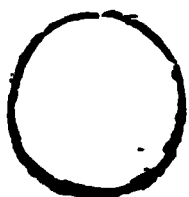
یہ قاعدہ طبعی ہے کہ کوئی زمین خواہ کیسی ہی بنجر نظر آئے، اور خواہ کتنی ہی اسباب و وسائل کشت کاری اور تربیت و پرورش زرعی سے محروم ہو، لیکن اگر اس کی قوت نشو و نما بالکل معدوم نہیں ہوگئی ہے، تو اس کا کوئی نہ کوئی گوشہ سرسبز، اور کسی نہ کسی کونے میں کوئی بیج سربرآورِ نظر آئے گا، اور ایسا ہونا اس امر کی دلیل سمجھا جائے گا، کہ گو اس زمین کو اپنے خزانہ ہائے نباتاتی کے ظہور کے وسائل حاصل نہیں، اور اسباب و ذرائع سے محروم ہوکر بنجر اور غیر شاداب سی ہوگئی ہے، تاہم اس کی قوتِ نشو و نما اب تک آمادۂ ظہور و ارتقا رہے۔ اور اگر دہقان کا ہاتھ اور بارانِ رحمت کی نظر میسّر آجائے، تو فوراً اس کی حالت میں انقلاب عظیم ہوسکتا ہے!

بعینہ یہی حال سرزمینِ حیات ملّت کا بھی ہے۔ گو اس کی تمام سطح سرسبزی و شگفتگی کی جگہ، خشکی و وحشت کا منظر ہو، تاہم اگر کسی ایک گوشے میں بھی چند سبز پتے اور شاخیں نظر آرہے ہوں، تو نا امید نہ ہونا چاہیئے اور سمجھنا چاہیئے کہ اس کی قوت نشو و نما ابھی تک فنا نہیں ہوئی اور دہقان کی محنت اور ابر کی بخشش اگر ساتھ دیں، تو کچھ بعید نہیں کہ یہی وحشت کدۂ ارضی، ایک جنت سماوی بن جائے!

O

آج صدیوں سے سرزمین اسلام پر جو تنزل و انحطاط قلب و دماغ پر طاری ہے، اس کا منظر یقیناً دردانگیز ہے، لیکن اس مایوسی میں جو چیز امید دلانے والی ہے، وہ صرف یہ کہ باایں ہمہ، خشک سالی اور قحط کے آثار گو ہر طرف ہیں، مگر

ہزاروں افراد کے ذریعہ نہیں، بلکہ ہمیشہ سرچشمۂ حیات ایک، یا ایک سے زیادہ چند نفوس قلیلہ و عدیدہ ہی میں ہوتا ہے۔ اس عالم کی زندگی قوموں سے ہے، مگر قوموں کی زندگی صرف اشخاص کے دم سے وابستہ ہے۔ سرزمین انسانیت میں جب ایک عمدہ بیج بارآور ہوکر سر اٹھاتا ہے، تو اس سے صدہا شاخیں پھوٹتی ہیں، اور ان میں ہزارہا تروتازہ پھل لٹکنے لگتے ہیں۔

پس باغ کی زمین کی طرح، اس زمین کی شادابی کے لئے بھی بہت سی خاردار اور بے ثمر جھاڑیوں کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ صرف ایک ہی درخت کی۔

ایک ہی انسان چاہیئے جو انسان ہو، اور ایک پوری قوم اور ایک پورے ملک کو زندہ کردے۔ اس عالم کی رونق اقوام کے دم سے وابستہ ہے۔ قومیں مرتی ہیں اور زندہ ہوتی ہیں۔ لیکن ان کی موت و حیات کے یہی معنیٰ ہیں کہ پہلی صورت میں اُن نفوس عالیہ سے خالی ہو جاتی ہیں، جن کے دم سے ان کی زندگی وابستہ تھی اور دوسری حالت میں ان کے اندر ایسے وجود قدسیہ موجود ہوتے ہیں جو اپنی زندگی کے سرچشمے سے پوری قوم کے کثرت و اقبال کو سرسبز و شاداب کردیتے ہیں:

کیا نہیں دیکھتے کہ کتنے آدمی ہیں، جن کا مرنا قوموں کا مرنا ہوتا ہے، اور کتنے ہیں جو اپنے ظہور کے اندر ایک پوری قوم اور ملک کی زندگی کو پوشیدہ رکھتے ہیں!

قیس سا پھر کوئی اٹھا نہ بنی عامر میں   فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

اسیرانِ جنگ

(۱)

یورپ نے جب کبھی اپنے تمدنی احسانات کا افسانہ دنیا کو سنایا ہے، تو
اس کے با اثر بنانے کے لئے "اسلام" اور "غلامی" کی داستانِ پارینہ کو بھی ضرور
دہرایا ہے۔ حالانکہ اس آسمان کے نیچے صرف اسلام ہی ایک ایسا لفظ ہے
جس کے ساتھ "غلامی" کا لفظ کسی حالت میں بھی جمع نہیں ہو سکتا! واللہ یعلم انہم
لکذبون!

لیکن اس کے متعلق پہلا سوال یہ ہے کہ کیا اسلام ہی اس بدعتِ سیئہ
کا موجد ہے؟ کیا دنیا کی دوسری مہذب قومیں فاتحانہ حوصلہ مندیوں کے جوش
میں گلا کاٹنا جانتی تھیں لیکن گلے میں طوق؟ ڈالنا نہیں جانتی تھیں؟ دنیا کی قدیم
تاریخ اس سوال کا جواب نہایت مایوسانہ اور شرمناک الفاظ میں دیتی ہے۔ گذشتہ
قومیں، اسیرانِ جنگ کو ایسا مجرم خیال کرتی تھیں جن کی حمایت کوئی قانون نہیں کر سکتا

زمین اب تک بنجر اور شور ثابت نہیں ہوئی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ زمانۂ شاداب اور وہ موسم نمو خیز اب چلا گیا، جب ہماری زمین کے ایک ایک ذرے سے نامورانِ عالم اور ابطالِ ملت اٹھتے تھے، اور دنیا کی تاریخ کے بڑے سے بڑے صفحوں پر قابض ہو جاتے تھے۔ تاہم اب بھی جب کبھی اسباب و وسائل ظہور جمع ہو جاتے ہیں تو کہیں نہ کہیں سے صدائے ابطال و امجاد کانوں میں آ جاتی ہے اور عالم اسلامی کا کوئی نہ گوشہ اوصاف و خصائل گرانمایہ کا نمونہ پیش کر دیتا ہے۔ اور اس طرح یقین ہو جاتا ہے کہ زمین کی قوتِ نشو و نما اب تک معدوم نہیں ہوئی اور یاس و قنوط کے وقت میں ابھی دیر ہے۔ اب بھی اگر اس زمین کی درستگی کی جائے اور وسائلِ زراعت مہیا ہو جائیں تو اس کا چپہ چپہ گلہائے عطر بیز اور درخت ہائے شاداب سے لہلہا سکتا ہے۔

ذٰلک بان اللّٰہ ھو الحق	اس لئے کہ اللہ اور اس کی پر اسرار قوتیں
وانہ یحی الموتٰی	برحق ہیں اور اس لئے کہ وہ مردوں کو زندہ
وانہ علی کل شیٔ	کر دیتا ہے، اور نیز اس لئے کہ وہ ہر مشکل سے
قدیر (۲۲:۷)	مشکل بات پر قادر ہے۔

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید
دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد

وتمدن کے دربار میں یہ عذر کر دیا کہ یہ لوگ پہلی بار رہا کر دئے گئے تھے، انھوں نے پھر دوبارہ جنگ میں شرکت کی، اور یہ خونریزی اسی جرم کا نتیجہ ہے، لیکن یہ عذر ناقابلِ قبول ہوا، اور اس وحشیانہ طرزِ عمل پر عام نکتہ چینی کی گئی۔ اس کے بعد رحم دلی کے جذبات نے رفتہ رفتہ اس قدر ترقی کی کہ قیدیوں کی جلاوطنی بھی تہذیب کے خلاف سمجھی گئی۔ یہاں تک کہ جب روس نے فریخ قیدیوں کو سائبیریا کی طرف جلاوطن کر دیا تو اس پر بھی سخت اعتراضات کئے گئے۔

لیکن قدیم علمائے سیاست میں اب بھی یہ امر مختلف فیہ رہا کہ اسیرانِ جنگ کے ساتھ اس قسم کا وحشیانہ سلوک جائز ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اب اگرچہ بہت سے بحث مباحثہ کے بعد یہ اختلافات مٹ گئے ہیں، اور زمانۂ حال کے مقننین نے یہ متفقہ فیصلہ دے دیا ہے کہ "اسیرانِ جنگ کو ایک محدود زمانے تک کیلئے اگرچہ شرکتِ جنگ کے خوف سے قید رکھا جا سکتا ہے، لیکن ان کو بیچنا، قتل کرنا، غلام بنانا، کسی قسم کا ضرر پہنچانا کسی حال میں بھی جائز نہیں" تاہم یہ مسئلہ اب بھی مختلف فیہ ہے کہ اگر قیدی خود فوج کے کسی سپاہی، یا جنرل کو ضرر پہنچائے، یا اس کو حراست میں رکھنا ناممکن ہو جائے، تو ایسی حالت میں اس کا قتل جائز ہے یا نہیں؟ بلونشلی اور بافر نے جواز کا فتویٰ دے دیا ہے، لیکن عموماً ارباب سلطنت کی رائے یہ ہے کہ "اس حالت میں بھی قیدی کو بالکل رہا کر دینا چاہیئے۔ اگر کوئی جنرل کسی شہر یا گاؤں کو اپنے قبضہ میں نہیں رکھ سکتا تو اس کو جلا دینے یا برباد کرنے کا حق اسے حاصل نہیں ہو جاتا پھر جان تو اینٹ پتھر کے ڈھیر سے زیادہ بیش قیمت اور عزیز ہے، پس صرف

تھا۔ اور اس لئے عموماً انھیں نہایت بے رحمی کے ساتھ ذبح کر دیا جاتا تھا۔
چنانچہ جنگ کے قیدیوں کے متعلق اشوری، فنیقی، مصری اور یہودی قوموں کا طرز عمل یہی تھا۔ بلکہ ان کا دستِ تطاول کبھی کبھی آزاد رعایا کی شاہ رگ تک بھی پہنچ جاتا تھا۔ فرعون نے بنو اسرائیل کے بچوں کو اسی ظالمانہ طرز عمل کی بناء پر ذبح کرنا شروع کیا تھا۔ ایک مدت کے بعد خود غرضی نے اس ظالمانہ نظام میں ایک نیا انقلاب پیدا کیا، یعنی قتل کی جگہ غلام بنانے کا رواج ہوگیا جو فاتح و مفتوح دونوں کے لئے قتل سے بہرحال بہتر تھا۔ سب سے پہلے روما نے اس کی ابتدا کی۔ ابتدا میں جو سپاہی جس شخص کو گرفتار کرتا وہی اس کا مالک ہو جاتا، مگر چند دنوں کے بعد سلطنت روما نے ان کی ملکیت اپنے ہی لئے مخصوص کرلی۔
لیکن روم نے قرونِ وسطیٰ میں پھر اسی وحشتِ قدیم کی تجدید کی، اور اسیرانِ جنگ کی گردنیں غلامی کے طوق سے نکل کر تہ تیغ آگئیں۔ ساتھ ہی سلطنت کو اسیرانِ جنگ کے متعلق بیع اور غلامی کا بھی عام اختیار حاصل ہوگیا۔
اس کے بعد خود غرضی نے ایک اور قدم آگے بڑھایا، یعنے فدیہ لینے کا رواج پڑا۔ اس کی بدولت بہت سے جنرل دولت مند ہو گئے۔ اس اصول کو اس قدر ترقی ہوئی کہ فدیہ کی صورت نے ایک مستقل تجارت کی صورت اختیار کرلی، اور قیدیوں کے مختلف گروہوں کا خاص خاص نرخ مقرر کیا گیا۔
لیکن اخیر زمانہ میں بوناپارٹ نے یافہ میں دو ہزار قیدیوں کو قتل کر کے قدیم خونیں منظر کو پھر نئے آب و رنگ کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا اور تہذیب

اب وہ قانون بن کر مکمل صورت میں دنیا کے سامنے آگیا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ تمام مہذب سلطنتیں اس پر عمل کر رہی ہیں۔ اسیرانِ جنگ کے متعلق اسلام کا جو طرزِ عمل تھا، اس پر نظرِ ثانی ڈالنے سے پہلے اس قانون پر نگاہ ڈال لینی چاہیئے۔

موجودہ قانون اسیرانِ جنگ :۔

اس قانون کے نتائج و دفعات حسبِ ذیل ہیں:۔

۱۔ اسیرانِ جنگ کی آزادی کو صرف اس قدر محدود کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی فوج میں نہ جا سکیں، اس کے علاوہ نہ تو ان کو کوئی سزا دی جا سکتی ہے، نہ ان کی توہین کی جا سکتی ہے، اور نہ ان پر آب و دانہ بند کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ قیدی کو فاتح کے فوجی نظام کا پابند ہونا پڑے گا۔ اگر اس نے خلاف ورزی کی تو فوجی عدالت سزا دے سکے گی۔

۳۔ قیدیوں کے اسباب سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا جا سکتا، نہ ان کے بدن سے کوئی کپڑا اتارا جا سکتا ہے، نہ ان کے جیب سے کوئی رقم نکالی جا سکتی ہے، اور نہ ان کے زیوروں کو ہاتھ لگایا جا سکتا ہے، بوقت اشد ضرورت کے اگر اس پر عمل ناممکن ہو جائے، تو اس حالت میں بھی ضرور ہے کہ واپسی کے وقت ان چیزوں کو لازمی طور پر واپس کر دیا جائے، جو ان سے علیحدہ کی گئی ہیں، لیکن حسنِ سلوک کے طور پر افسروں کو تلوار واپس کر دی جاتی ہے اور اب اس کا عام رواج ہو گیا ہے۔

۴۔ قیدی عموماً کسی محفوظ شہر یا قلعہ یا چھاؤنی میں رکھے جاتے ہیں۔ ان کے

اس عذر کی بناء پر کہ قیدی قابو میں نہیں رہتا، اس کا قتل کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا۔"

عام قیدیوں کے متعلق موجودہ قانونِ جنگ نے یہ فیاضانہ وسعت حاصل کی ہے۔ لیکن جب وزراء، سلاطین و امراء دشمن کے ہاتھ آجاتے ہیں، اور وہ بھی قیدیانِ جنگ میں محسوب ہوتے ہیں، تو اس کی فیاضی کا دائرہ اور وسیع ہو جاتا ہے، اور ان کے ساتھ عام قیدیوں کی طرح برتاؤ نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ عموماً تمام سلطنتوں نے ان کے حفظِ مراتب کا خیال رکھا ہے۔ جرمنی کی فوجوں نے جب میدان میں نپولین ثالث شاہ فرانس کو گرفتار کیا تو اس کے ساتھ نہایت شریفانہ سلوک کیا تھا، اور اس کے رہنے کے لئے ایک خاص محل خالی کرا دیا تھا۔ روس نے بھی امیر شامل چرکسی کی عزت و توقیر کو قائم رکھا تھا، اور انگریزوں نے اگرچہ جزیرہٗ ہیلانا میں نپولین کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا، لیکن زولروں کے سردار اور ٹرانسول کے جنرل کرونجی کے ساتھ حالتِ قید میں وہ بھی نہایت عزت و احترام کے ساتھ پیش آئے تھے۔

لیکن تمدن و تہذیب کی وسعت کے ساتھ جنگ کی خونی چادر کا دامن بھی وسیع ہوتا گیا، اور اس کے تمام نتائج کی ترقی کے ساتھ قیدیوں کی تعداد میں بھی غیر معمولی اضافہ ہو گیا، چنانچہ پہلی جنگ جرمنی و فرانس میں صرف فرانسیسی قیدیوں کی تعداد تین لاکھ پینتالیس ہزار تک پہنچ گئی تھی جن میں ۱۱۱۶ افسر بھی شامل تھے۔ اس بنا پر اسیرانِ جنگ کے متعلق ایک خاص قانون بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

البتہ اب اسکی نگرانی سختی کے ساتھ کی جائے گی ۔
لیکن اگر تمام قیدی بھاگنے کی سازش کرلیں اور اس کا راز طشت از بام ہوجائے، تو پھر ان کو ہر قسم کی سخت سزا یہاں تک کہ پھانسی بھی دی جاسکتی ہے ۔

۹ ۔ کوئی قیدی دوسرے قیدی کا ذمہ دار نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے اگر کوئی قیدی بھاگ جائے تو اس کے دوسرے ساتھیوں سے بازپرس نہیں کی جاسکتی ۔

۱۰ ۔ اگر قیدی عدم شرکت جنگ کا حتمی وعدہ کریں تو ان کو اثنائے جنگ میں بھی رہا کیا جاسکتا ہے، اور وہ اپنے وطن واپس جاکر دوسرے سیاسی مشاغل میں مصروف ہوسکتے ہیں، نیز دوسرے ملکوں سے جنگ بھی کرسکتے ہیں بشرطیکہ وہ ملک اس سلطنت کا حلیف نہ ہو، جس نے ان کو رہا کیا ہے ۔
لیکن اگر قیدیوں نے بدعہدی کی تو اس جرم میں پھانسی تک دی جاسکتی ہے۔ قیدی جس حکومت کی رعایا ہیں اگر وہ فوج کے اخلاقی حقوق کا بھی لحاظ رکھتی ہے، تو انھیں خدمت فوجی سے مستثنیٰ کردے گی، اور اگر اس کا قانون اس قدر فیاض نہیں ہے، تو قیدیوں کو وظائف عسکری سے انکار کرنے پر سزا دے سکتی ہے، بایں ہمہ اخلاقی حیثیت سے ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ ولایات متحدہ امریکہ نے اس مسئلہ میں دوسرا طرز عمل اختیار کیا ہے، یعنی اگر وہ قیدیوں کے قول و قرار کا احترام نہیں کرسکتی، تو انھیں قیدی بناکر اس حکومت کے پاس واپس کردیتی ہے، جس نے ان کو رہا کیا

کے لئے ایک محدود مقام متعین کر دیا جاتا ہے، اس میں سیر و تفریح کی بھی اجازت دی جا سکتی ہے۔ لیکن گننے کے وقت فوراً حاضر ہو جانا چاہیئے۔

۵۔ افسروں کو عام قیدیوں سے زیادہ آزادی دی جاتی ہے۔ قیدیوں کو بھاگ جانے کے خوف سے یا قانونِ جنگ کی خلاف ورزی کرنے پر جیل خانے میں بھی قید کیا جا سکتا ہے، لیکن ان کو مجرموں سے علحدہ رکھا جائیگا۔

۶۔ اگر متخاصمین میں شرائط مقرر ہو گئے ہیں تو ان کے مطابق کھانے پینے کے بارے میں قیدیوں سے عمدہ سلوک کیا جائے گا، لیکن اگر اس قسم کے شرائط مقرر نہیں ہوئے ہیں تو جو خوراک فاتح کی فوج کو ملتی ہے وہی قیدیوں کو بھی دی جائے گی، اور صلح و مبادلہ کے وقت تک مصارف کا بار فاتح ہی کے خزانے پر ہوگا۔

۷۔ دیانت اور شرافت کا اقتضا یہ ہے کہ قیدی کو اپنے ملک و قوم کے خلاف شریک جنگ ہونے پر اور اپنی فوج یا اپنے وطن کے افشا راز کرنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ البتہ قیدیوں سے اس قسم کے آسان کام لئے جا سکتے ہیں جو سخت تکلیف دہ اور پُر خطر نہ ہوں، اور جنگ سے غیر متعلق ہوں نیز فوجی عزت کو ان سے صدمہ نہ پہنچے۔

۸۔ قیدیوں کا بھاگ جانا کوئی جرم نہیں ہے، البتہ ان کے گرفتار کرنے کی ہر ممکن تدبیر اختیار کی جا سکتی ہے۔ یہاں تک کہ حالتِ فرار میں گولی بھی ماری جا سکتی ہے۔ لیکن اگر وہ بھاگ کر اپنی فوج سے مل گیا اور دوبارہ گرفتار ہو گیا، تو اس جرم پر کہ پہلے بھاگ گیا تھا، کوئی مزید سزا نہیں دی جا سکتی

سوئٹزرلینڈ کی آخری بین الملی کانگریس نے اپنا ایک پورا اجلاس اس کی تکمیل میں خرچ کیا ہے۔

اس قانون کو پیش نظر رکھ کر اب چاہیئے کہ ہم اسلام کے اس طرز عمل اور سلوک کی تفتیش میں نکلیں جو اس نے اسیرانِ جنگ کے ساتھ کیا ہے اور جس سے ہم ایک " اسلامی قانون اسیرانِ جنگ کا استنباط کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک مختصر اور اجمالی نظر عرب جاہلیت کی حالت پر بھی ڈال لی جائے۔ کیونکہ اسلام کا مبدا ظہور وہی ملک، اور وہیں کی آب و ہوا کی نشوو نما تھی۔

اہلِ عرب اور اسیرانِ جنگ:۔

اسلام کے زمانے تک اگرچہ مہذب قوموں میں فدیہ لے کر اسیرانِ جنگ کے رہا کر دیتے کا رواج ہو گیا تھا، لیکن عموماً ایک انتقام پسند عرب جاہلی، بغض و کینہ کے جذبات پر مال و دولت کو قربان کر دیتا تھا۔

چنانچہ ایک عورت کو جب معلوم ہوا کہ اس کا بھائی عمرو اس کے دوسرے مقتول بھائی کو خون بہا لے کر صلح کرنا چاہتا ہے، تو اس نے طنز آمیز لہجے میں انتقام لینے پر بیٹے کو اشتعال دلایا:۔

ودع عنك عمرو ان عمروا مسالم

وهل بطن عمرو غير شبر لمطعم

عمرو کا ذکر نہ کرو، وہ تو آمادۂ صلح ہے۔ عمرو کا پیٹ ہے تو بالشت بھر کا مگر پھر بھی نہیں بھرتا، اس لئے وہ دیت لینا چاہتا ہے۔

ہے۔ اگر اس نے قیدی بنانے سے انکار کر دیا، تو پھر ان پر اس معاہدہ کی پابندی باقی نہیں رہتی۔

۱۱۔ قیدیوں کے مبادلہ سے قید کی پابندیاں اٹھ جاتی ہیں، اور قیدی بالکل آزاد ہو جاتے ہیں۔ مبادلہ بالکل اختیاری ہے، اور رہا شدہ قیدیوں کے متعلق بصراحت طے کر لینا چاہیئے کہ وہ دوبارہ فوج میں شامل ہو سکیں گے یا نہیں؟

مبادلہ میں قیدیوں کے مدارج کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ افسر کا افسر کے بدلے میں، زخمی کا زخمی کے بدلے میں، مریض کا مریض کے بدلے میں، مبادلہ کیا جا سکتا ہے۔ نیز ایک افسر کا مبادلہ متعدد چھوٹے درجے کے سپاہیوں کے عوض کیا جا سکتا ہے۔

۱۲۔ اختتام جنگ کے ساتھ ہی قید کی مدت بھی ختم ہو جاتی ہے اور تاوان جنگ یا کسی دوسرے مال کے معاوضے میں قیدی رہا کر دیئے جاتے ہیں۔

(از تاریخ علم الحقوق مصطفےٰ رشید پاشا)

(۲)

گذشتہ نمبر میں ان قوانین و دفعات کا خلاصہ ہم درج کر چکے ہیں۔ جو اسیرانِ جنگ کے متعلق آج یورپ کے ادعاء تمدن و تہذیب کا دلنشیں طغریٰ ہے، موجودہ عالمگیر جنگ کے بعد یہ ادعاء باقی رہا ہو) سدرۃ المنتہیٰ ہے، اور جس سے زیادہ وہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ دفعات گذشتہ چالیس سال کے اندر بتدریج قرار پائے ہیں، اور

فآبوا بالنهاب وبالسبایا   وأبنا بالملوک مصفدینا

یعنی عام لوگ تو مالِ غنیمت اور معمولی قیدیوں کو لے پلٹے، مگر ہم بادشاہوں کو ہتھکڑیاں پہنا کر لائے ہیں۔

لونڈیوں کے ساتھ اس سے بھی زیادہ وحشیانہ برتاؤ کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ قید کی حالت میں ان سے ہر قسم کا تمتع جائز سمجھا جاتا تھا۔ عمرو بن عمرو نے جب قبیلہ بنو عبس کے بہت سے قیدی گرفتار کئے تو ایک نوخیز لڑکی سے ناجائز تمتع بھی کیا۔ اسی بنا پر فرقہ شعوبیہ نے (یہ فرقہ عرب کا دشمن تھا) عرب پر اختلاط نسب کا الزام لگایا ہے۔ کیونکہ وہ قیدی عورتوں سے جبراً تعلق پیدا کرتے۔ صاحب عقد الفرید اور ابن قتیبہ نے اسے بالتفصیل لکھا ہے۔

اسلام اور اسیرانِ جنگ:۔

اسلام دنیا میں آیا تو پہلے معرکۂ جہاد ہی میں اس کے سامنے اسیرانِ جنگ کا مسئلہ پیش ہوا۔ چنانچہ غزوۂ بدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ستر قیدی پیش کئے گئے، تو اُن کے بارے میں آپ نے حضرت ابوبکرؓ سے مشورہ کیا۔ انھوں نے فدیہ لے کر رہا کر دینے کی رائے دی۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے اختلاف کیا۔ انھوں نے کہا کہ دشمنانِ حق کو فدیہ لے کر چھوڑ دینا کیسا! ہر مسلمان شخص کو چاہیئے کہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنے کافر عزیزوں کو قتل کر کے محبت حق کا ثبوت دے

---

(۱) اس حصے کے لئے بلوغ الارب۔ ذکر ایام العرب از ص۔ ۶۱۔ تا ص ۸۳ کا مطالعہ بہتر ہوگا۔ کیونکہ اس میں احوال جاہلیت کے اکثر مطالب یکجا کر دیئے ہیں۔

فان انتم لم تثاروا واتدیتم

فمشوا باذان النعام المصلم

پس اگر تم لوگ خون کا انتقام نہیں لیتے، بلکہ خون بہا لیتے ہو، تو جاؤ، ہر جگہ ذلت و خواری کے ساتھ رسوا پھرو!

اس بناء پر اہلِ عرب اسیرانِ جنگ سے فدیہ بہت کم لیتے تھے، اور اکثر نہایت بے رحمی کے ساتھ قتل کر ڈالتے تھے۔ حربِ کلاب میں جب کندہ کا سردار گرفتار ہوا تو قیس بن عاصم نے پہلے اپنی کمان سے اس کے دانت توڑ ڈالے، پھر اپنے سردار نعمان بن جباس کے بدلے میں اسے قتل کر ڈالا۔ بنو ضبہ نے جب محرق غسانی اور اس کے بھائی حبش بن دلف کو قید کیا تو فوراً دونوں کی گردن مار دی۔ عامر بن مالک نے سعید بن زرارہ کے ساتھ اس قدر سختیاں کیں کہ وہ حالتِ قیدی میں مر گیا۔ زمانہ اسلام میں حباب کو بھی بنو عامر نے قید کر کے اسی طرح قتل کر دیا تھا۔

پھر اہلِ عرب اگر قیدیوں کے ساتھ کچھ فیاضی کرتے بھی تھے، تو وہ فیاضی یہ تھی کہ ذلت کا ایک داغ دے کر انھیں رہا کرتے۔

عون بن احوص نے معاویہ ابن جون کو رہا کیا تو پیشانی کے بال کاٹ کر رہا کیا۔ قبیلہ بنو یربوع نے جب عرب کے مشہور بادشاہ منذر بن السماء کے بیٹے قابوس کو ایک معرکے میں قید کر لیا، تو اسی قسم کا ذلت آمیز برتاؤ کیا۔

آج مہذب دنیا حالت قید میں بادشاہوں کے ساتھ شریفانہ برتاؤ کرنے پر فخر کرتی ہے، لیکن اہلِ عرب اُن کی تذلیل و تحقیر کو اپنا ایک ناز سمجھتے تھے اور یہی عرب کی اصلی فطرت حریت ہے۔ چنانچہ عرب کا مشہور شاعر عمرو بن کلثوم کہتا ہے:

فی الغنائم قبل ان تحل لھم فانزل اللہ: لولا کتٰب من اللہ لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم (ترمذی کتاب التفسیر ص ۵۰۳)

حلال ہونے سے پیشتر ہی لوگوں نے لوٹنا شروع کر دیا۔ اس پر خدا نے یہ آیت نازل فرمائی کہ اگر خدا کا حکم پہلے سے نہ ہو چکا ہوتا تو جو کچھ تم نے لوٹا ہے اس کی پاداش میں تم پر بڑا عذاب نازل ہوتا۔

یہی وجہ ہے کہ آیت کی تفسیر میں بر بنا احادیث صحیحہ ہمارا مسلک عام مفسرین کی راہ سے الگ ہے۔ اور اس کی پوری تحقیق سورۂ انفال و توبہ کی تفسیر سے معلوم ہو سکے گی۔

غزوہ بدر کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو طرز عمل رہا، اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس آیت نے فدیہ پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ چنانچہ آپؐ نے غزوہ بنی مصطلق میں تمام اسیران جنگ کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا تھا[1]۔

فدیہ کا مقصد:۔

اسلام اگرچہ فدیہ کا موجد نہ تھا بلکہ زمانۂ قدیم سے جو رسم چلی آتی تھی وہی جاری رہ گئی تھی۔ بایں ہمہ اسلام کا طرز عمل اس معاملہ میں تمام دنیا سے مختلف تھا۔ اعمال کے نتائج کا اثر خود عمل سے نہیں ظاہر ہوتا بلکہ نیت سے ظاہر ہوتا ہے۔ اختلاف نیت سے ایک ہی عمل کا نتیجہ مختلف صورتوں میں ظاہر ہو سکتا ہے گذشتہ قوموں نے فدیہ کی جو رسم قائم کی تھی اس سے اسیران جنگ پر احسان تو ضرور ہو جاتا تھا لیکن وہ بالکل عارضی تھا۔ انھوں نے اسے مال و دولت

---

[1] ترمذی ص ۲۹۱۔

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے پر عمل فرمایا اور فدیہ لے کر تمام قیدیوں کو رہا کر دیا۔

مفسرین کرام کے نزدیک حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کی رائے صحیح تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ اسی بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل پر خدا نے یہ عتاب آمیز آیت نازل فرمائی:۔

ما کان لنبی ان تکون له اسری حتی یثخن فی الارض تریدون عرض الدنیا واللہ یرید الاخرۃ واللہ عزیز حکیم۔ لولا کتاب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم فکلوا مما غنمتم حلالا طیبا واتقوا اللہ ان اللہ غفور رحیم (انفال)

پیغمبر کے لئے قیدی بنانا اس وقت تک کیلئے جائز نہیں جب تک کہ وہ فرض جہاد کو پوری طرح ادا نہ کر لے۔ تم لوگ دنیاوی مال و دولت کے بھوکے ہو اور خدا تو صرف آخرت کا ثواب چاہتا ہے۔ وہ غالب اور حکیم ہے اور خدا کا حکم پہلے سے نہ ہو چکا ہوتا تو جو مال تم نے لیا ہے اس کی پاداش میں تم پر بڑا سخت عذاب نازل ہوتا۔ مگر اب جو کچھ مال غنیمت تم نے لوٹا ہے اس کو حلال اور پاک چیزوں کی طرح کھاؤ بلاشبہ اللہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

لیکن ترمذی کی ایک روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ اس آیت کو اسیران بدر کے فدیہ سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ وہ مال غنیمت کے متعلق نازل ہوئی ہے:۔

فلما کان یوم بدر وقعوا

جب معرکہ بدر پیش آیا تو مال غنیمت کے

کسی مالی معاوضہ کے آزاد کر دیا کرتے تھے۔ قبیلہ بنو مطلق کے بعض اسیران جنگ سے اگر آپ نے فدیہ لیا، تو قیدیوں کا ایک گروہ بلا معاوضہ بھی رہا کر دیا ہے۔

وکان منھم من من علیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ومنھم من افتدی فلم یبق امراۃ من بنی المصطلق الا رجعت الی قومھا۔	ان کے بعض قیدیوں کو آپ نے احساناً رہا کر دیا اور بعض سے فدیہ لیا۔ اس طرح بنو مطلق کی ہر گرفتار شدہ عورت اپنی قوم میں واپس چلی گئی۔ اور ایک عورت بھی نہ بچی جو قید میں رہ گئی ہو۔

(طبقات ابن سعد۔ جلد ۲۔ ص۔ ۴۶)

غزوہ دومۃ الجندل:۔

غزوہ دومۃ الجندل میں تقریباً ایک سو بچے اور عورتیں قید کر لی گئی تھیں لیکن جب ابو زید مسلمان ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کے رہا کرنے کی درخواست کی۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کے ذریعہ حضرت زید بن حارثہ کو حکم دیا:۔

ان تجلی بینھم وبین حرمھم	ان کی عورتوں کو بالکل آزاد کر دو۔

(ابن سعد۔ جلد ۲۔ ص۔ ۴۴)

بنی تمیم وہوازن:۔

غزوہ بنی تمیم میں صحابہ گیارہ عورتوں اور تیس بچوں کو گرفتار کر لائے آنحضرت

طبقات ابن سعد۔ جلد ۲۔ ص۔ ۱۱۶

جمع کرنے کا ایک ذریعہ بنا لیا تھا۔ قدیم قوموں میں بہت سے جنرل اسی کی بدولت دولت مند ہو گئے۔ لیکن اسلام نے اس کا دائرہ صرف رہائی کے احسان تک ہی محدود کر دیا۔ چنانچہ کفار نے جب ایک سردار کی لاش کو فدیہ دے کر واپس لینا چاہا تھا تو آنحضرتؐ نے صاف انکار کر دیا تھا[1]۔ اسلام نے اگر فدیہ کو مالی فائدہ حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا ہوتا تو فدیہ لے کر لاشوں کو واپس کرنا زندہ انسانوں کی واپسی سے زیادہ آسان اور بے ضرر تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسیرانِ بدر کے متعلق فدیہ لینے کا جو مشورہ دیا تھا، اس سے صرف مالی فائدہ اٹھانا مقصود نہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اس سے فوجی مصارف میں مدد ملے گی۔ پس اس آیت کا وہی شانِ نزول تسلیم کر لیا جائے جس کو حضرات مفسرین کرام نے بتایا ہے، تو اس سے بھی صرف یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ فدیہ کو دنیاوی فوائد کے حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیئے۔ چنانچہ خدا خود کہتا ہے:۔

تریدون عرض الدنیا	تم دنیاوی فوائد چاہتے ہو، اور خدا تمھارے
واللہ یرید الآخرۃ	لئے آخرت کا ثواب چاہتا ہے۔

لیکن اس سے فدیہ لے کر بطور احسان رہا کر دینے کی نفی لازم نہیں آتی؛ اور دراصل اس مبحث سے اس آیت کو کوئی تعلق ہی نہیں۔

مگر اسلام کا دریائے کرم ان خس و خاشاک کا بھی پابند نہیں ہو سکتا تھا آنحضرتؐ نے اگرچہ بعض موقعوں پر فدیہ قبول کر لیا تھا، لیکن آپ عموماً قیدیوں کو بغیر

---

[1] طبقات ابن سعد۔ جلد ۲۔ ص ۶۴

حملے کئے ہیں اور وہ گرفتار ہو کر آئے ہیں، کفارِ مکہ کی ایک جماعت نے جو ۸۰ اشخاص سے مرکب تھی، عین نماز فجر میں آپ پر حملہ کرنا چاہا اور صحابہ نے ان کو گرفتار کر لیا۔ لیکن آپ نے ان کو بھی بغیر کسی مالی معاوضہ کے بلا تامل آزاد کر دیا۔[1]

عہدِ نبوت میں متعدد قبائل کے ڈاکوؤں نے ایک جتھہ قائم کر لیا تھا، اور عام طور پر ڈاکہ مارتے پھرتے تھے۔ آپ نے ان کی گرفتاری کے لئے فوج بھیجی مگر جب وہ گرفتار ہو کر آئے تو سب کو آزاد کر دیا۔ چنانچہ عرب نے ان کو عتقاء (آزاد شدہ) کا خطاب دیا۔ آگے چل کر اسی نام سے انھوں نے ایک مستقل قبیلہ کی شکل اختیار کر لی، اور بعہدِ عمرو بن عاص مصر میں آباد ہو گئے۔

واقعہ ثمامہ بن آثال:۔

مالی معاوضہ کی سب سے زیادہ توقع امراء اور رؤساء سے ہو سکتی تھی، اس لئے اگر اگر اسلام نے حصولِ دولت و مال کا ذریعہ بنایا ہوتا، تو وہ سب سے زیادہ امرا کے آگے اپنے دامن کو وسیع کرتا۔ لیکن اس نے امرا کو بھی اسی طرح آزاد کر دیا، جس طرح وہ ایک غریب بدوی کو آزاد کر دیتا تھا۔ صحابہ کرام اہلِ یمامہ کے سردار ثمامہ بن آثال کو گرفتار کر کے لائے، اور مسجد کے ایک ستون سے باندھ دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو اس سے پوچھا کہ تیرے پاس کیا ہے؟ اس نے کہا: "اگر آپ قتل کرنا چاہتے ہیں تو میرے پاس رگوں میں خون ہے۔ اگر احسان کرنا چاہتے ہیں تو میرے پاس زبانِ شکر گزاری ہے، اگر آپ مال چاہتے

---

[1] مسلم جلد ۲۔ ص ۵۰۷

نے ان کو رملہ بنت حارث کے گھر میں بند کر دیا، لیکن جب اس قبیلہ کے سردار آئے تو ان کو دیکھ کر قیدیوں نے رونا پیٹنا شروع کیا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے تمام قیدیوں کو ان کے ساتھ رہا کر کے واپس کر دیا۔[1]

غزوہ ہوازن میں علاوہ بہت سے مال غنیمت کے ۶ ہزار زن و مرد گرفتار ہوئے تھے لیکن جب وہ لوگ مسلمان ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مال غنیمت کے واپس کرنے کی درخواست کی، تو آپ نے فرمایا "مال اور قیدی دونوں واپس نہیں کئے جا سکتے۔ ایک کو اختیار کر سکتے ہو۔" ان لوگوں نے قیدیوں کو واپسی کے لئے انتخاب کیا۔ چونکہ تمام قیدی تقسیم کر دئے گئے تھے، اس لئے آنحضرت نے ایک خطبہ دیا، جس کا مطلب یہ تھا:۔[2]

"جو لوگ قیدیوں کو بخوشی واپس کرنا چاہیں وہ واپس کر دیں، لیکن اگر کچھ لوگ مالی معاوضہ چاہتے ہوں تو چاہیئے کہ صبر کریں۔ اس کے بعد میرے حصہ میں جو مال خمس کا آئے گا، میں اس میں سے ہر قیدی کے عوض ۱۶ اونٹ دے دوں گا۔"

لیکن تمام صحابہ نے قیدیوں کو بخوشی واپس کر دیا۔[3]

قاتلوں کے ساتھ سلوک:۔

بعض حالتوں میں آپ پر دشمنوں نے کمین گاہوں سے نہایت خداعانہ

---

[1] طبقات ابن سعد۔ جلد۔۲۔ ص۔ ۱۱۱

[2] یہ واقعہ ابوداؤد، بخاری، مسلم، سب میں ہے۔

[3] ابوداؤد۔ جلد۔ ۲۔ ص۔ ۱۰

آستانۂ اسلام اور غلامانِ عرب :-

غلاموں کے ساتھ آنحضرت کے اس کریمانہ برتاؤ کی شہرت ہوئی، تو شہر مکّہ کے بہت سے غلام بھاگ بھاگ کر آپ کی خدمت میں آگئے کہ آپ کے دامنِ کرم میں پناہ لیں۔ یہ رنگ دیکھکر کفار نے آپ کو خط لکھا کہ "ان غلاموں کو آپ کے مذہب سے کوئی خوش اعتقادی نہیں ہے، صرف آزادی کی کشش ان کو آپ کی خدمت میں کھینچ لے گئی ہے۔" صحابہ نے بھی اس کی تائید کی اور کہا "کفار سچ کہتے ہیں۔ آپ ان کو واپس کر دیجئے" لیکن آنحضرت صحابہ پہ سخت برہم ہوئے اور فرمایا "اب ان کو واپس نہیں کیا جا سکتا۔ یہ خدا کی راہ میں آزاد ہیں"[1] کفار کا بیان کیونکر سچ ہو سکتا تھا؟ انہوں نے کہا کہ ان غلاموں کو اسلام سے کوئی خوش اعتقادی نہیں جو اس آستانۂ کرم پر آزادی کے لئے آئے ہیں، لیکن اگر یہ سچ تھا کہ وہ آزاد ہونے کے لئے آئے تھے تو اس کا یہی مطلب تھا کہ وہ مسلمان ہونے کے لئے آئے تھے تو اس کا یہی مطلب تھا کہ وہ مُسلمان ہونے کے لئے آئے تھے۔ کیونکہ اسلام اس کے سوا کیا ہے کہ وہ ہر طرح کے دماغی و جسمانی غلاموں کو آزاد کر دینے کے لئے ظاہر ہوا؟

اسیرانِ بنو قریظہ :-

تمام غزوات میں آپ نے بظاہر سب سے زیادہ سختی بنو قریظہ کے ساتھ کی تھی۔ جنہوں نے اپنے تخلّفِ عہد و میثاق سے اپنے تئیں سخت سے سخت تشددات کا مستحق بنا دیا تھا، لیکن ان کے قیدی بھی آپ کے لطف و مراعات سے محروم نہ رہے آپ نے بہت سے قیدیوں کو آزاد کر دیا۔[2]

[1] ابو داؤد جلد۔۲۔ ص۔۱۴۰ [2] طبقات ابن سعد جلد۔۲۔ ص۔۹۱

ہوں، تو جس قدر مطلوب ہو بآسانی دیا جاسکتا ہے۔ یہ آنحضرت سن کر واپس ہوگئے اور دوسرے دن پھر یہی سوال کیا، اس نے بھی اپنے پہلے ہی جواب کا اعادہ کیا۔ آپ بھی واپس گئے، تیسرے دن پھر وہی سوال کیا، اس نے پھر وہی جواب دیا۔ آپ نے حکم دیا کہ بلا کسی معاوضہ کے اسے بالکل آزاد کردو وہ آزاد ہوکر مسجد سے نکلا تو ایک کھجور کے درخت کے پاس جاکر پہلے غسل کیا پھر مسجد میں آکر کلمۂ توحید پڑھا اور کہا:۔

"اے محمد (صلعم) خدا کی قسم! دنیا میں میرے لئے تمھارے چہرہ سے زیادہ مکروہ چہرہ نہ تھا۔ لیکن آج مجھے آپ کے رخسار سب سے زیادہ محبوب نظر آتے ہیں۔ میرے نزدیک تمھارے مذہب سے زیادہ مبغوض کوئی مذہب نہ تھا، لیکن آج تمھارا دین مجھے تمام مذاہب سے زیادہ عزیز معلوم ہوتا ہے، میں تمھارے شہر سے زیادہ کسی شہر کو قابل نفرت نہیں سمجھتا تھا، لیکن آج تمھارا شہر مجھے تمام شہروں سے زیادہ دلفریب نظر آتا ہے۔ میں عمرہ کی غرض سے چلا تھا راستہ میں آپ کی فوج نے مجھے گرفتار کرلیا۔ اب آپ کا کیا حکم ہے؟"

آپ نے اس کو عمرہ ادا کرنے کا حکم دیا۔ لیکن جب وہ مکہ میں آیا تو اہل مکہ نے اسے طعنہ دینا شروع کیا کہ "یہ گمراہ ہوگیا"۔ لیکن اس نے کہا "تم غلط کہتے ہو میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس مسلمان ہوا ہوں، پھر گمراہ میں ہوں یا تم؟ اب جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حکم نہ دیں گے، یمامہ سے مکہ میں گیہوں کا ایک دانہ بھی نہ آسکے گا۔"

---

[1] مسلم جلد ۲، ص ۷۵

عقائد سے بھی تعرض نہیں کیا۔ مدینہ میں یہود کے مذہبی اثر نے اس قدر وسعت حاصل کر لی تھی کہ اگر کسی عورت کے بچے زندہ نہیں رہتے تھے تو وہ نذر مانتی تھی "اگر اس کا بچہ زندہ رہے گا تو وہ اسے یہودی بنائے گی" ، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہود بنو نضیر کو جلا وطن کیا تو ان میں سے اس قسم کے بہت سے بچے تھے انصار نے ان کو روکنا چاہا، لیکن اس پر یہ آیت نازل ہوئی:۔

لا اکراہ فی الدین، قد تبین الرشد من الغی۔ [1]

مذہب میں اکراہ و جبر نہیں۔ بلاشبہ اب اب حق باطل کے مقابلہ میں بالکل واضح و روشن ہو گیا ہے۔

مبادلہ:۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیدیوں کے ساتھ قیدیوں کا مبادلہ بھی کیا ہے۔ ابن سلمہ کا بیان ہے:۔

"جب قبیلہ بنو فزارہ پر حملہ کیا گیا تو میں اس قبیلہ کی ایک عورت کو گرفتار کر لایا۔ اس کے ساتھ اس کی نوخیز لڑکی بھی تھی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ امیر الجیش تھے۔ انھوں نے مال غنیمت کو تقسیم کیا تو وہ لڑکی مجھ کو ملی۔ میں اس کو مدینہ لے آیا۔ بازار میں حسن اتفاق سے آنحضرت کا سامنا ہو گیا۔ آپ نے اس لڑکی کو دیکھ کر فرمایا کہ اس عورت کو مجھ پر ہبہ کر دو۔ میں نے کہا: خدا کی قسم میں نے اب تک اسے ہاتھ نہیں لگایا ہے، اور اب اس کو آپ کی نذر کرتا ہوں؛ لیکن آپ نے اس لڑکی کو لے کر اہل مکہ کے پاس واپس بھیج دیا۔ اور کفار نے اس کے عوض میں سو

---

[1] ابوداؤد۔ جلد ۲۔ ص ۹۰

قیدیوں کی ضروریات :-

دور جدید کے فیاضانہ قانون کی رو سے قیدیوں کے بدن سے زیور یا کپڑا نہیں اتارا جا سکتا ، لیکن اسلام کی فیاضی نے صرف اتنا ہی نہیں کیا بلکہ خود قیدیوں کو کپڑا بھی پہنا دیا ۔ غزوہ بدر میں جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ آپ کے سامنے برہنہ کھڑے ہوئے ، تو آپ نے ان کو عبداللہ بن سلول کی قمیص لے کر پہنائی ۔[1] احسان اسی کا معاوضہ تھا کہ آپ نے اس کے مرنے کے بعد اپنا کرتہ اس کے سن کے لئے دیا تھا ۔ قبیلہ ہوازن کے قیدیوں کی تعداد تقریباً ۶ ہزار تھی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو کپڑا پہنا کر واپس کیا ۔

اسیران جنگ کے جذبات کی رعایت :-

قید کی حالت میں جسمانی تکلیفوں سے زیادہ انسان کے جذبات کو صدمہ پہنچتا ہے ، لیکن آج تک دنیا کی کسی قوم نے قیدیوں کے جذبات کا لحاظ نہیں کیا ، صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے ۔ جس نے جسم کے ساتھ قیدیوں کی روح کو بھی سکھ پہنچایا ہے ۔ قید کی حالت میں وہ منظر نہایت دردانگیز اور رقت خیز ہوتا ہے جب بھائی بھائی سے ، بیٹا باپ سے ، شوہر بیوی سے بہ جبر ایک غیر متعین مدت کے لئے جدا کر دیتے جاتے ہیں ۔ لیکن اسلام نے قید کی حالت میں ہمیشہ عزیزوں کی باہمی یکجائی سے ان کے لئے تسکین کا سامان مہیا کیا ۔ جب حضرت علی نے ایک لونڈی کو اس کی لڑکی سے جدا کرنا چاہا تو آنحضرت نے ممانعت فرمائی تھی[2] ۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے کبھی قیدیوں کے مذہبی جذبات و

---

[1] طبقات ابن سعد جلد ۲ ۔ ص ۔ ۱۱ [2] ابوداؤد جلد ۲ ۔ ص ۔ ۲۰ ؛

مسلمان قیدیوں کو رہا کر دیا۔

اس واقعہ سے ایک دوسرے اہم مسئلہ کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے، آنحضرت کے زمانے میں امراء کے خاندان کو جو عورتیں گرفتار ہو کر آئیں، اُن میں جویریہ اور صفیہ کے ساتھ آپ نے خود نکاح فرمایا چونکہ وہ اور باتوں کے ساتھ حسن و جمال میں بھی نہایت ممتاز تھیں، اس لئے یورپ اس کو بدگمانی کی نگاہ سے دیکھتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت قید کی حالت میں بھی شرفا کی عزت کا ہمیشہ لحاظ رکھتے تھے۔ صفیہ پہلے دحیہ کلبی کے حصّہ میں آئی تھیں، لیکن وہ ایک امیر ترقت کے خاندان کی چشم و چراغ تھیں، ظاہر ہے کہ ایک رئیسہ کے حفظ مراتب کا دحیہ لحاظ نہیں رکھ سکتے تھے۔ جویریہ اپنے بدل آزادی کے لئے جس طرح پریشان حال پھرتی تھیں، وہ ان کے لئے بھی سخت توہین کا باعث تھا۔ اور صفیہ نے تو خود اس خیال کو ظاہر بھی کر دیا تھا، اسی بناء پر آنحضرت نے ان کی اس ذلت کو گوارا نہیں کیا، اور خود ان کے ساتھ نکاح کر کے ان کی خاندانی عزت میں اور اضافہ کر دیا۔ چنانچہ آپ کے طرزِ عمل سے خود صحابہ کو بھی اس کا احساس ہو گیا تھا۔ صفیہ کو ایک شخص نے یہ کہکر آنحضرت کی خدمت میں پیش کیا:۔

یا نبی اللہ: اعطیت دحیہ صفیہ بنت حی بن اخطب سید قریظۃ والنضیر، لا تصلح الا لک۔ سلہ ۰۰۰۰۰	یا رسول اللہ! آپ نے صفیہ کو جو حی ابن اخطب سردار قریظہ و نضیر کی لڑکی ہے وحیہ جیسے معمولی شخص کے حوالے کیا ہے۔ لیکن وہ صرف آپ ہی کیلئے موزوں ہے۔ ختم شد